اپنا دیس اپنے لوگ

تصویری سفرنامہ

سبوحہ خان

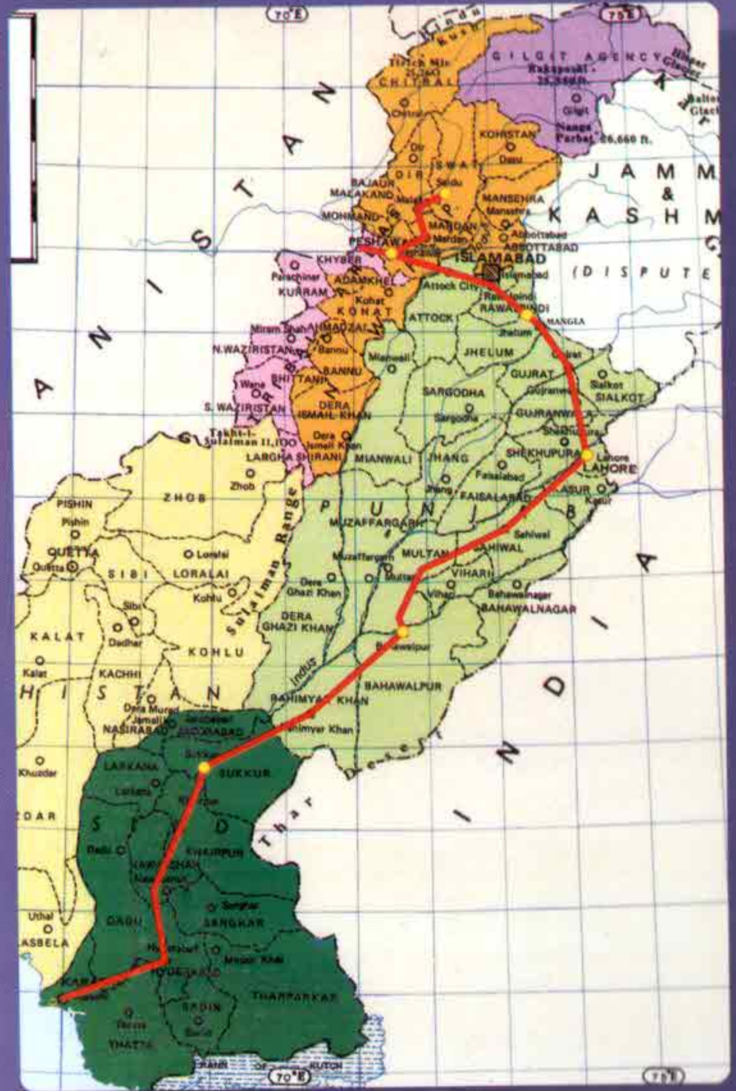


اپنا دیس اپنے لوگ

تصویری سفرنامہ

آڈیو سی ڈی کے ساتھ

سبوحہ خان



سیلانی شعیب عالم کے نام

میں فقط چلتی رہی، منزل کو سر اس نے کیا

ساتھ میرے، روشنی بن کر سفر اس نے کیا

پروین شاکر

پیش لفظ

سفرنامے پڑھتے پڑھتے اور خود سفر کرتے کرتے عمر گزر گئی۔۔ پڑھنے اور سفر کرنے میں، انگریزی اردو دونوں ؛سفر؛ کی کیفیات سے گزرنا پڑا۔ اسکے باوجود یہ حقیر نہ سفر کرنے سے باز آیا نہ ہی سفرنامے پڑھنے سے۔ اب ملاحظہ فرمایئے، ابن بطوطہ، محمد شبلی اور مارکو پولو سے لے کر منشی محبوب عالم کے ؛سفر یورپ؛ تک بلا مبالغہ ہزارہا سفرنامے پڑھے ہیں۔ اور یہ وہ سفرنامے ہیں جن کی اہمیت، افادیت اور دلچسپی روز آخر تک باقی رہے گی لیکن ان ہزارہا سفرناموں میں وہ سفرنامے بھی شامل ہیں جو ہمارے اخبارات کے صفحات (بالخصوص میگزین سیکشن) کی زینت بڑھاتے رہتے ہیں اور وہ بھی جو کتابی صورت میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور ان کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آخر متعلقہ ؛سفر لندن؛ ؛سفر روم؛ ؛سفر چین؛ وغیرہ میں کونسی ایسی خاص بات تھی جو کتابی صورت میں شائع کرنے کی زحمت برداشت کی گئی۔ اگر سفر مقامی نوعیت کا بھی ہو تو اس میں بھی دلچسپی، فائدے اور اطلاع کے عناصر شامل کئے جاتے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ بیشتر سفرنامے محض یہ اطلاع دینے کے لئے شائع کئے جاتے ہیں کہ مصنف یا مصنفہ نے فلاں مقام کا سفر کیا اور یہ کہ یہ سفر کر کے انہوں نے پڑھنے والوں پر احسان عظیم کیا ہے، مزید یہ بھی کہ اگر یہ سفر نہ کیا جاتا تو دامن اردو میں سفرناموں کا ذخیرہ نامکمل رہ جاتا۔۔۔۔ اس کے باوجود دل وحشت پسند کی تسکین کے لئے میں ہر طرح کے سفرنامے ذوق وشوق سے پڑھتا رہتا ہوں۔

حال ہی میں ؛اپنا دیس۔۔۔ اپنے لوگ؛ مطالعے میں آیا۔۔ یہ سفرنامہ جو وطن عزیز کے انتہائی جنوب سے انتہائی شمال تک بذریعہ قومی شاہراہ کیا گیا، ان مشاہدات پر مشتمل ہے جو اکثر عام نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ سبوحہ خان صاحبہ نے اپنے سفرنامے میں محض مشاہدات کا ہی تذکرہ نہیں کیا بلکہ اپنے تاثرات بھی بیان کئے ہیں، تاثرات جو ہر محب وطن پاکستانی کے ہونے چاہئیں۔ اور شاید یہی وہ عنصر ہے جو عام سفرناموں میں موجود نہیں ہوتا۔ اپنا دیس۔۔۔ اپنے لوگ دراصل مصنفہ اور ان کے شریک سفر رفیق حیات کے سفر کی روداد نہیں بلکہ پاکستان۔۔ آج کے پاکستان کی روداد ہے۔۔۔ پچھلے پچاس سال کے قومی سفر کی روداد ہے، یہ روداد ہے کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور اب نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے بعد اپنی منزل سے کتنی دور ہیں؛ اور یہ سب کچھ ناقدانہ انداز میں نہیں بلکہ بیانیہ طرز میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔۔۔ اور پھر یہ بیان اشاروں میں قلم بند کیا گیا ہے۔

سبوحہ خان نے جو ؛دلی سے ڈیفینس؛ لکھ کر پہلے ہی اپنے زور قلم کا سکہ جما چکی ہیں، ایک بار پھر ایک عام موضوع پر یہ مختصر سی روداد سفر قلم بند کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک دردمند دل کے تاثرات بہت خوب صورتی سے ادا کرتے ہوئے پڑھنے والوں کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر سکتی ہیں۔۔ اور یہی اس سفرنامے کی وہ خوبی ہے جو اسے عہد رواں کے سفرناموں سے ممتاز کرتی ہے۔

عبیداللہ بیگ

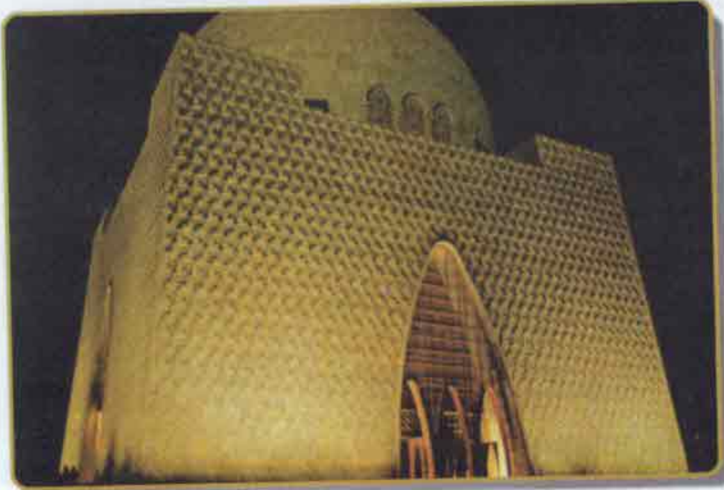
اپنا دیس اپنے لوگ

اگر چہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں مگر میں خوش ہوں۔ایک آسودگی ہے کہ پور پور میں اتری جاتی ہے۔ایک یادوں کا سمندر ہے جس کا شور پیچھے کی طرف کھینچتا ہے اور باہر ایک خاموشی ہے۔خاموشی اور مکمل سکوت۔ایسی خاموشی جس کی اپنی ایک آواز ہے۔جگہ جگہ آپ پڑھتے ہیں اور سنتے بھی رہتے ہیں کہ خاموشی کی اپنی ہی ایک آواز ہوتی ہے مگر جب آپ خود اس کیفیت سے گزرتے ہیں تب آپ اس بات کی اصلیت کو سمجھ پاتے ہیں کہ وہ آواز کیا ہے؟ خاص طور پر کراچی کے رہنے والے لوگ تو زندگی بھر اس آواز کو ترستے ہیں۔

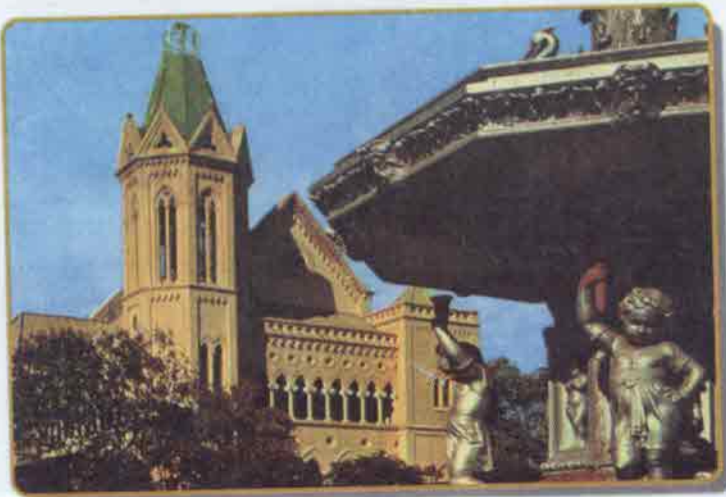
میں کہ آج انٹر پاک اِن ہوٹل کے کمرہ نمبر ۳۲۱ میں ایک بیڈ پر آنکھیں بند کئے لیٹی ہوں۔ میرے دائیں پہلو میں عظیم الشان سکھر بیراج ہے، دائیں طرف ہی دادو کینال ہے اور بائیں طرف رائس کینال ہے۔میرے پاؤں کی طرف دریائے سندھ بہتا ہے۔ یہ ہوٹل دو نہروں کے درمیان واقع ہے۔ایک اور تیسری نہر، کیرتھر رائس کینال کے پہلو میں بہتی ہے۔جب ہم ٹہلنے کے لئے نکلے تو لگتا تھا کہ ایک موسیقی ہے کہ ہر طرف بکھری ہوئی ہے۔ایک مسلسل آواز ہے جو کانوں کو بے حد بھلی محسوس ہوتی ہے۔یوں تو ہر خوبصورت آواز ہی کانوں کو اچھی لگتی ہے مگر اپنی جگہ ہر آواز کی ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ اسی طرح تینوں نہروں کی آوازیں بھی اپنی جگہ جدا تھیں اور دریائے سندھ کی آواز ان سب سے جدا تھی ۔جنت میں تو نہریں دودھ کی ہوں گی، مگر یہاں پر کشمیری چائے کی نہریں تھیں کہ بہتی ہی چلی جاتی تھیں ۔جی چاہتا تھا کہ ایک کپ میں اس چائے کو لے کر پیاس بجھائی جائے۔ پانی کا یہ رنگ اس لال مٹی کی وجہ سے ہے، جس کا سکھر کی اپنی مٹی سے کوئی تعلق نہیں۔سکھر کی مٹی قطعاً لال نہیں۔لال رنگ تو حرکت کا رنگ ہے۔آزادی کا رنگ ہے۔ یہ تو دریائے سندھ ہے جو نہ جانے اسے کہاں سے چرا کر لایا ہے۔ دریائے سندھ کے بھی اپنے رنگ اور اپنے انداز ہیں کہ جہاں سے گزرتا ہے ایک نئے رنگ، ایک نئی ترنگ میں ہوتا ہے۔اس کے کنارے بسنے والی ہر تہذیب سمجھتی ہے کہ یہ اس کا ساتھی ہے۔اسے کیا

معلوم کہ یہ تو ایک ہرجائی ہے کہ جہاں سے گزرتا ہے اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے، مگر سکھر میں ابھی یہ کسی اور ہی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ شاید ابھی تک پرانے محبوب کا نشہ باقی ہے۔

یوں تو سکھر بیراج کے مقام پر سے دریائے سندھ میں سے سات نہریں نکالی گئی ہیں مگر اس جگہ پر میں صرف تین نہروں کو دیکھ سکتی ہوں۔ سب سے پہلے دادو کینال ہے۔ اس کے ساتھ رائس کینال ہے جس کا شور دادو کینال پر حاوی ہے۔ اس کے علاوہ رائس کینال کے کنارے بھی دادو کینال سے زیادہ بنے سنورے ہیں اور اسکے بناؤ سنگھار میں انسانی ہاتھوں کا دخل ہے۔ شاید اس کا یہی غرور ہے کہ یہ دادو کینال سے زیادہ اونچی لَے میں گنگناتی ہے۔ دادو کینال کے ایک کنارے پر کچے گھر ہیں، جن کے دروازوں پر پڑے ہوئے گندے اور بوسیدہ پردے مکینوں کی بے چارگی کا حال کہتے ہیں اور دوسری طرف درخت اس طرح کھڑے ہیں کہ جیسے خوشی کے مارے اس نہر کو چوم لینے کو بیقرار ہوں اور ایک قطار میں بس اس پر جھکے ہی چلے جاتے ہیں۔ شام کو ہم نے نہر کے کنارے بنے ہوئے ان کچے مکانوں کے ساتھ چہل قدمی کی تھی۔ کنارے پر مکانوں کے ساتھ ساتھ ریت ہی ریت ہے۔ اگرچہ نہر اتنا نزدیک بہتی ہے مگر کنارہ بے انتہا خشک ہے۔ لگتا ہے نہر کو بھی اس کے کنارے پر رہنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہاں پر یہ بھی بے فیضی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس بات سے بے نیاز ہے کہ اس کے پڑوسی سبزے کو ترستے ہیں۔ کنارے پر سات آٹھ بچے ملگجے سے لباس میں اس مٹی سے کھیل رہے تھے۔ اجنبیوں کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے ان کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ کسی بھی بچے کے گریبان کے بٹن سلامت نہیں تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک دلچسپی اور حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ اگرچہ ہمارے اور ان کے رنگوں اور نقوش میں زیادہ فرق نہیں تھا، لیکن شاید ہمارا پہناوا ان سے مختلف تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک آٹھ دس سالہ لڑکی ایک بچے کو گود میں اٹھائے کھڑی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو چند اور لڑکیوں کو آواز دے کر بلا لیا، گویا کہ ہم ان کے لئے ایک تماشا تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ لڑکیاں شرما شرما کر ہنستی تھیں۔ گھروں کے نزدیک مویشیوں اور گوبر کی بدبو تھی۔ دھوئیں کا ایک بادل تھا جو نہر کے کنارے کو آلودہ کرتا تھا، اتنا زیادہ کہ ہم اس کی تلخی کو اپنے حلق میں محسوس کرتے تھے۔ پردوں کے پیچھے سے اب عورتیں بھی ہمیں جھانکتی تھیں۔ ہر گھر سے دھواں اٹھتا تھا اور پکتی ہوئی دال کی خوشبو قطعاً اشتہا انگیز نہیں تھی، کیونکہ گوبر



مزار قائد کراچی



فریئر ہال کراچی



بندرگاہ کراچی



ایمپریس مارکیٹ کراچی

کی بدبو ہر خوشبو پر حاوی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں لڑکے درختوں پر چڑھ گئے اور نظروں سے غائب ہو گئے اور لڑکیوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی لڑکیاں مجھے ہاتھ لگا لگا کر کچھ کہتی تھیں!

'' بیگم۔۔۔بیگم۔۔۔مانی۔۔۔مانی!'' تھوڑی دیر بعد مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ مجھ سے روٹی مانگ رہی ہیں کہ سندھی میں ''مانی'' روٹی کو کہتے ہیں۔

دادو کینال اور سکھر بیراج کے درمیان ایک کچی سڑک ہے، جس پر چند چھوٹے چھوٹے چائے خانے ہیں۔ ایک موچی ہے جو اپنے کام میں مصروف ہے۔ ایک پرانے درخت کے نیچے چند سندھی بزرگ شیشوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مرقع، محراب دار لال سندھی ٹوپیاں پہنے کسی بحث میں مصروف ہیں۔ ایک چارے کی دکان سے مرثیوں کی آواز آ رہی ہے۔ یہ کچی سڑک آپ کو اندرون شہر کی جانب لے جاتی ہے۔ اندرون شہر جہاں آپ کو بہت سے اردو بولنے والے بھی ملتے ہیں۔

سورج غروب ہونے کو تھا ہم نے سوچا کیوں نہ ڈوبتے سورج کا نظارہ سکھر بیراج کے اوپر جا کر کیا جائے۔ اسی وقت ایک صاحب اپنے محافظوں اور اہلِ خانہ کے ساتھ اوپر گئے تھے۔ داخلی دروازے پر داخلہ ممنوع ہے کا بورڈ لگا تھا، مگر سیکیورٹی گارڈ نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ بیراج سے ہم دور تک شہر سکھر کو دیکھ سکتے تھے۔ ڈوبتا ہوا سورج منظر کو اداس کر رہا تھا۔ بیراج پر ریل کی ایک پٹڑی بھی تھی جو اس کی تعمیر کے زمانے میں استعمال ہوتی تھی اور اب بھی مرمت کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس پر کرین اور دوسری مشینیں چلائی جاتی ہیں۔ سکھر کا پرانا پل اور بقیہ چار نہریں بھی یہاں سے نظر آتی ہیں۔

سکھر بیراج کی تعمیر ۱۹۲۸ میں شروع ہوئی اور ۱۹۳۲ میں یہ بن کر مکمل ہوا۔ دریائے سندھ کو روک کر اس سے سات نہریں نکالی گئی ہیں، جو سندھ کے ایک بہت بڑے رقبے کو سیراب کرتی ہیں۔ ہوٹل کے لاؤنج میں کوئی بک شاپ نہیں تھی جو مجھے شہر کی تاریخ بتا سکے، یا شہر کے کسی خاص مقام کے بارے میں مجھے کچھ معلومات فراہم کر سکے۔ یہاں کی تاریخ صرف سکھر بیراج ہے، نہ اس سے پہلے کچھ تھا نہ اس کے بعد کچھ ہے۔ باہر ایک بلڈنگ پر لگی دو تختیوں کے مطابق تین نومبر ۱۹۲۸ کو گورنر بمبئی سر لیزلی اورے ولسن نے اپنے آخری دورہِ سندھ کے موقع پر اس کا سنگ بنیاد رکھا اور پھر تیرہ جنوری ۱۹۳۲ کو اس

کی نقاب کشائی کی گئی۔اس بند سے ساڑھے پانچ ملین ایکڑ زرعی زمین کو سیراب کیا جاتا ہے۔اس کی تعمیر پر ۴۵.۴ ملین روپیہ خرچ ہوا۔اس کے علاوہ ۱۶۰ ملین روپے کینال نیٹ ورک پر خرچ کیا گیا۔اس کے چیف انجینیئر کا نام بسٹو تھا۔ بیراج کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا میوزیم ہے جو بیراج کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتا ہے۔مگر وہاں کے چوکیدار کے مطابق میوزیم صرف ''صاحب'' کی اجازت پر ان کے ''خاص مہمانوں'' کے لئے ہی کھولا جاتا ہے۔ ہمارے بہت اصرار پر اس نے ہمارے لئے وہ ہال کھول دیا جہاں بیراج کا مکمل ماڈل موجود ہے۔اس وقت کی مشہور کمپنی لینگڈن سیمنٹ نے بیراج کا ایک گیٹ کا ماڈل نمونے کے طور پر بنایا تو اس کا تمام سیمنٹ لندن سے لایا گیا، حالانکہ اگر اس وقت یہاں سیمنٹ کی فیکٹری قائم کر لی جاتی تو خرچہ اور وقت دونوں بچ جاتے مگر حاکم وقت ہمیں صرف خام مال کا ملک بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ بیراج میں کل سڑسٹھ گیٹ ہیں۔زمین کی وہ فوٹو بھی میوزیم میں موجود ہے جو بیراج شروع کرنے سے پہلے لی گئی تھی۔اگر چہ وہ اب کافی حد تک مٹ چکی ہے، کیونکہ اس کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ بیراج بناتے وقت کی بھی بہت سی تصاویر ہیں، جس میں جگہ جگہ انگریز بہادر چیف انجینیر صاحب ہیٹ لگائے اور نیکر پہنے کھڑے ہیں۔ ہر گیٹ کے بارے میں مکمل تفصیل موجود ہے کہ اس پر کتنا لوہا اور سیمنٹ لگا۔ جب گیٹ ہاتھ سے کھولے جاتے تھے تو اس میں پچاس منٹ لگتے تھے اور جب بجلی سے کھلنے لگے تو صرف آٹھ منٹ لگتے تھے۔ایک جگہ بجری مٹی اور روڑی کے نمونے رکھے ہوئے تھے، جو بیراج کی تعمیر میں استعمال ہوئے یا زمین کی کھدائی کے دوران نکلے۔ یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ کنکریٹ یعنی ملبے کو سنبھالنے کے لئے سریے سے کس قسم کا جال بنایا گیا تھا۔

سات نہروں کا بھی ماڈل تھا کہ کون سی نہر کتنی چوڑی ہوگی۔ تین نہریں سکھر بیراج کے دائیں جبکہ چار نہریں بائیں کنارے سے نکالی گئی ہیں۔سب سے چوڑی نہر نارا کینال ہے۔ بیراج کے اوپر جانے والی سیڑھیوں کے باہر ایک بڑا سا تناور درخت ہے جس کی دور تک پھیلی ہوئی شاخیں اس کی بزرگی کی گواہی دیتی ہیں۔ بیراج کے پہریدار خیر محمد نے بتایا کہ یہ درخت اس کے والد کے زمانے میں لگایا گیا تھا۔اس کا والد گل شیر جس نے اس بیراج کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ جانے کتنے گل شیر ہوں گے جن کے خون پسینے کی مہک ان نہروں میں شامل ہے اور ہماری زمین کو سیراب کرتی ہے۔



سکھر بیراج کی سنگ بنیاد



جامع مسجد سکھر



سکھر



سکھر



دریائے سندھ سکھر



پُرانا پُل سکھر



رائس کینال سکھر



جامع مسجد سکھر

کل گیارہ مارچ! صبح ناشتے کی میز پر اچانک شعیب نے مجھ سے کہا!

''کیوں نہ ہم بائی روڈ گلگت تک چلیں۔'' میں نے شعیب کو مشکوک نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں۔ ''آر یو آؤٹ اوف یور مائنڈ؟'' (اگرچہ اس کے لئے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی)

''کون ڈرائیو کریگا؟''

''آپ اور میں۔''

''آپ کو پتہ ہے آپ کی عمر کیا ہے۔ ستر میں صرف دو سال کم۔''

''تو؟''

''اور ہر وقت جیب میں وہ دوائی بھی رہتی ہے کہ اگر دل کام کرنا بند کردے تو......''

''مگر ابھی تو دل کام کر رہا ہے نا!''

'مگر سڑکیں!!۔۔۔ یہ امریکا نہیں پاکستان ہے'

''کچھ نہیں ہوتا۔ ہم کل صبح چلیں گے۔ رات سکھر میں گزاریں گے۔ اگلی رات بھاولپور، پھر لاہور، منگلا، پنڈی، پشاور، لنڈی کوتل، تورخم، سوات، کالام، گلگت......اور پھر واپس۔''

مجھے معلوم ہی تھا کہ اب تو جانا ہی ہے۔ میں نے اپنے دوست اعجاز اور قمر کو فون کیا، لیکن ضروری تو نہیں کہ دیوانوں کے دوست دیوانے ہی ہوں۔ وہ اتنے مختصر نوٹس پر جانے کو تیار ہی نہیں ہوئے۔ اپنے بھائی سے پوچھا۔ وہ بھی اچانک جانے پر تیار نہیں تھے۔ ہاں یہ ضرور پوچھا کہ ''یہ بتاؤ تمہارے میاں وقت کے ساتھ جوان ہو رہے ہیں یا بوڑھے؟''

اس سے پہلے ہم ۱۹۶۷ میں اور پھر ۱۹۷۱ میں بائے روڈ کراچی سے پشاور گئے تھے۔ چھوٹی سی فوکس ویگن تھی اور مٹی کھائی ہوئی ٹوٹی سڑکیں تھیں۔ گاڑی ایئر کنڈیشنڈ نہیں تھی اور گود میں دو سال کا عامر تھا۔ عامر، جو گاڑی میں بیٹھنے کا بے حد شوقین تھا مگر ملتان پہنچ کر گاڑی میں بیٹھنے کے نام پر زور سے سر ہلا کر کہتا تھا ''نہ۔۔۔نہ۔۔۔نہ۔ نا نا نا۔'' گاڑی اندر باہر ہر طرف سے دھول سے اٹ گئی تھی، مگر اس وقت ایک ایسی چیز ہمارے پاس تھی کہ جس کے ہوتے ہوئے آپ بڑی سے بڑی مشکل پر قابو پا لیتے ہیں اور وہ تھی جوانی۔ کپڑے جھاڑتے تھے اور دوبارہ فریش ہو کر گاڑی میں بیٹھ جاتے تھے، حالانکہ راحت سعید

نے مجھے سمجھایا کہ جوانی کا تعلق ہرگز گزرتے ہوئے سالوں سے نہیں ہوتا۔ بعض لوگ بیس سال کے بوڑھے ہوتے ہیں اور بعض لوگ ستر سال کے جوان ہوتے ہیں۔ قصہ مختصر کہ میں نے شعیب عالم کو ستر سال کا جوان جانا اور سر پہ کفن باندھ کر چلنے کو تیار ہوگئی کہ اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔

اگلی صبح ہم گیارہ بجے اپنی بلیو ائیر کنڈیشنڈ بلی نو میں بیٹھ کر حیدرآباد کی طرف روانہ ہوگئے۔ پتہ نہیں کیوں ہم اپنے ملک سے اتنے مایوس تھے کہ سمجھے تھے اتنے سال میں سڑکوں میں کوئی تبدیلی ہی نہیں آئی ہوگی۔ جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ہمت بڑھتی گئی۔ ڈرتے تھے کہ بس ابھی ٹوٹی ہوئی سڑکیں شروع ہو جائیں گی، مگر دل تھا کہ خوش ہوتا ہی چلا جاتا تھا۔ حیدرآباد کے بعد ریت اور مٹی کی جگہ سبزہ ہی سبزہ تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ٹریفک بھی بہت ہی آرڈر (قرینے) میں تھا۔ تمام ٹرک اور دوسری بڑی گاڑیاں سلو لین میں تھے اور فاسٹ لین صرف اوورٹیک کے لئے استعمال کی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اب تو ڈرائیونگ میں راوی چین ہی چین لکھتا ہے کہ اچانک شعیب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ سامنے والی بس فاسٹ لین میں ہماری طرف آ رہی ہے؟ میں نے کہا مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا لیکن یہ تو واقعی ہی ۔۔۔سچ مچ ہی۔۔۔ یہ بادِ نسیم نہیں بس۔۔۔ بس ہے اور یہ سچ مچ کی بس ہے۔ میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ بس ہے اور اس کا رخ ہماری طرف ہے۔ بروقت ہم سلو لین میں ہو گئے اور وہ نازنین فراٹے بھرتی ہوئی ہمیں ششدر مگر زندہ چھوڑ کر گزر گئی۔ میں نے کہا یہ صرف ہمارے ملک ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ہم محتاط ہو گئے اور ہر سامنے سے آنے والی چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے کہ کہیں اس کا رخ ہماری طرف نہ ہو۔ ہم نے امریکا اور کینیڈا میں کم از کم ۲۰۰۰۰ کلو میٹر کا سفر کیا ہوگا مگر ایسا منظر نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد اس کے بھی عادی ہو گئے اور پھر سے خوبصورت مناظر میں کھو گئے۔

اپنے ملک میں اگر سڑکیں اچھی ہوں تو اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اگرچہ ہم امریکہ کی سڑکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، مگر اپنا ملک اپنا ہی ہے۔ خاص طور پر لوگ اپنے لگتے ہیں۔ اجنبیت کا قطعاً احساس نہیں ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں یقین ہوتا ہے کہ اگر کوئی بھی مسئلہ ہوا تو یہ لوگ مدد ضرور کریں گے۔ تمام راستہ بہت اچھا گزرا۔ سڑکوں سے ہمیں کوئی خاص شکایت نہیں ہوئی۔ سڑک کے دونوں طرف زیادہ تر کھیت ہیں۔ شوگر مل کی طرف جاتی ہوئی بڑی بڑی اونٹ گاڑیاں اور بیل گاڑیاں ہیں جو گنوں سے لدی

ہوئی تھیں۔ گڑھی خدا بخش اور نواب شاہ کو جاتی ہوئی سڑک تھی۔ آم کے درخت تھے اور کہیں کہیں نالے بہتے تھے۔ ہاں سپر ہائی وے سے گزرتے ہوئے راستے میں نوری آباد ضرور نظر آیا جس کا دھواں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جننگ مل تھی جہاں پُھٹی (کپاس) سے بنولہ (بیج) نکالا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر کوئی خاص صنعتیں نہیں لگائی گئی ہیں۔

ہم تقریباً شام پانچ بجے سکھر پہنچے۔ ہمیں کیونکہ دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر ٹھیرنا تھا اس لئے ہم نے ایک بہت لمبا پل عبور کیا اور دریا کے پار پہنچے۔ شہر سے ہوتے ہوئے جب مین بازار میں پہنچے تو پتہ چلا کہ ہم مطلوبہ ہوٹل تو شروع میں ہی چھوڑ آئے ہیں۔ ہم واپس ہوئے اور اس بہانے تانگے اور گدھا گاڑی کے اس شہر کو بہت نزدیک سے دیکھ لیا۔ جی چاہا کہ میں بھی ایک گدھا گاڑی پر بیٹھ کر پورے شہر کی سیر کروں مگر وائے میرا شہری رویہ کہ جس نے مجھے بزدل بنا دیا ہے۔

ہوٹل کافی بڑا تھا مگر عدم توجہی کا بھی شکار تھا۔ کمرہ بہت بڑا تھا، مگر پردوں کے پیچھے بیٹھی چھپکلیاں مجھے گھورتی تھیں۔ صرف مجھے اس لئے کہ شعیب کو ان کے گھورنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہوٹل کے بیرے ڈارک گرین پینٹ اور ہلکی سبز قمیضوں میں ملبوس تھے۔ جوتوں کی حالت بتاتی تھی کہ گزارہ کچھ مشکل سے ہوتا ہے۔ روشنیوں کے شہر کراچی کے بعد سکھر بہت اندھیرا اندھیرا سا شہر محسوس ہوتا ہے۔ ایک سناٹا اور خاموشی ہے جو رات کے وقت اور گہری ہو جاتی ہے اور آج شام میں اس ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھتے ہوئے سوچتی ہوں کہ اس گلابی دریا نے نہ جانے کتنے زمانے اور کتنی اقوام کو دیکھا ہے۔ کتنی تہذیبوں کو اپنے پاؤں تلے روندا ہے، لیکن آخر ایک سفید قوم نے اس کی منہ زوری پر کچھ ایسی لگامیں ڈالیں کہ اس کا رخ موڑ دیا اور اسے مجبور کر دیا کہ یہ ہزاروں ایکڑ زمین کو سیراب کرے۔ مٹیالی شام کی تاریکی میں دریا کے بیچوں بیچ ایک خالی کشتی کھڑی ہے۔ جانے کتنے سوہنی مہینوال کو اس نے پار لگایا ہوگا۔ صدیوں پرانے کچے گھڑے کی خوشبو آج بھی فضا میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ کتنا لمبا سفر ہے تیرا، کتنی تہذیبیں تیرے کنارے عروج تک پہنچ کر کھنڈر میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ صدیوں کا یہ سفر۔۔۔ تبت کے پہاڑوں سے نکل کر کشمیر، لداخ، اسکردو، گلگت سے گزرتا ہوا پنجند کے ملاپ پر خود اپنی پیاس بجھاتا ہوا تو یہاں تک پہنچا ہے۔ جلال میں آ جائے تو کنارے بسنے والوں کو مٹا کر رکھ دیتا ہے، ورنہ خراماں خراماں

لوگوں کے دکھ سکھ کا ساتھی بن جاتا ہے۔ تُو پاکستان کا سدابہار بادشاہ ہے۔ کبھی لگا میں سخت کر کے مارشل لاء لگا دیتا ہے اور کبھی ایک عادل بادشاہ کی طرح لوگوں کی خبر گیری کرتا ہے۔

کراچی میں رہتے ہوئے آپ بالکل بھول جاتے ہیں کہ آسمان پر ستارے بھی ہوتے ہیں۔ آسمان پر ستارے دیکھ کر میں بڑی رومینٹک ہو جاتی ہوں۔ جانے کون کون سے بھولے بسرے قصے دنیا سے کہیں دور لے جاتے ہیں، مگر شعیب ہمیشہ مجھے سائنسی حقیقتوں کی طرف لے آتے ہیں۔ انہوں نے غالباً ان پچیس سالوں میں کم از کم دو سو مرتبہ مجھے بتایا ہوگا کہ یہ گریک مائیتھولوجی کی بیلٹ آف اوراین ہے۔ یہ سات ستارے راستہ بتانے کے لئے ہیں۔ ان تین ستاروں کی سیدھ میں دیکھا جائے تو یہ اس طرف شمال ہے۔ اگر ہم شمال کی طرف منہ کریں تو ہمارے دائیں طرف مشرق ہوگا اور بائیں طرف مغرب ہوگا اور ظاہر ہے پیچھے کی طرف جنوب ہوگا۔ مگر میں ہوں کہ پھر بھی ہر نئی جگہ جا کر اپنے دماغ پر قطعاً زور نہیں ڈالتی بلکہ شعیب سے پوچھتی ہوں کہ کعبہ کس طرف ہے؟

رات کا کھانا ہم نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال کے ملگجے سے اندھیرے میں کھایا۔ اگلے دن ہم ذرا جلدی اٹھے۔ شہر ابھی محوِ خواب تھا اور ہم آسانی سے اندرون شہر کی سیر کر سکتے تھے۔ جگہ جگہ بچے سڑک پر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کچے اور پکے اور دو منزلہ گھر تھے۔ ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے اندھیرے گھر اور گلیاں تھیں۔ زیادہ تر لوگ گدھا گاڑی پر سوار تھے۔ شہر کے عین بیچ میں دو مسجدیں تھیں۔ مسجدوں کے مینار اتنے بلند تھے کہ اس تنگ سڑک پر سے اس کی تصویر لینا مشکل تھی۔ مسجد پر ہالہ کی ٹائلز کا کام کیا گیا تھا۔ جامع مسجد کے بورڈ پر ایک اشتہار لگا تھا جس پر لکھا تھا "اشتہار لگانا منع ہے۔" دور پرے کسی مندر کا مینار بھی جھانکتا تھا اور کہتا تھا کہ کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا۔ کیونکہ نو محرم تھا اس لئے ہر دکان اور گاڑی سے مرثیوں کی آواز آتی تھی۔ ایک گلی بڑے فخر سے اپنے نام کا اعلان کرتی تھی! "شاہراہ اقوام متحدہ۔" میوزیم کے چوکیدار کا کہنا تھا کہ سکول کم ہیں اور کبھی کبھی کھلتے ہیں۔ خوبصورت، مضبوط اور متاثر کر دینے والی عمارتیں صرف وہی تھیں جو کبھی انگریزوں نے بنائی تھیں۔ دن میں پانی کی آواز کم سنائی دیتی تھی، اگرچہ دریائے سندھ شہر کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ ایک جزیرہ نما جگہ پر بے حساب بھینسیں تھیں۔ دریا کے کنارے پر، بہت نیچے ایک عورت اپنی کشتی میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ سرکٹ ہاؤس تھا، جہاں

کبھی چیف انجینیر صاحب رہتے تھے اب یہ جگہ کانفرنس کے لئے آفس کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ بیراج کے نزدیک اپھروں کی بنی ہوئی بڑی بڑی حویلیاں اور گھر تھے جہاں کبھی انگریز اپنی فیملیز کے ساتھ رہتے ہوں گے۔ ان کی عورتیں اپنے چھوٹے چھوٹے گھروں میں سے نکل کر ان حویلیوں میں گھریلو نوکروں کے ایک جھنڈ کے ساتھ رہتی ہوں گی۔ جہاں چینی اور آٹا اور دوسرا راشن نوکروں کو تول کر دیا جاتا تھا، تاکہ دیسی لوگوں (براؤن نیٹوس) کو ان کی اوقات پر رکھا جا سکے۔ پتہ نہیں بیراج پر کام کرنے والے اس خیر محمد کی کیا سوچ تھی کہیں اس کے خیال میں اس گورے کی جگہ ہم نے تو نہیں لے لی۔ پتہ نہیں انگریز بہادر کے جانے سے اس کے شب و روز میں کچھ فرق پڑا یا نہیں۔ بیراج کے کنارے لگا نیم کا پرانا درخت نہ جانے کن کن زیادتیوں کا گواہ ہے۔ شاید میں بھی اس کی نظر میں اس پرانے انگریز کا امیج ہوں کہ وہاں کے بچے مجھ سے مانی یعنی روٹی مانگتے ہیں۔ ان بچوں کو دیکھ کر مجھے جاوید اقبال کی کتاب والی وہ بچی یاد آ گئی جو انہیں چین میں ملی تھی جس نے بڑے فخر سے اپنے ہاتھ کے گٹھے ان کو دکھا کر کہا تھا کہ "دیکھو میرے ہاتھ میں ستارے ہیں، کیا تمہارے ہاتھ میں ستارے ہیں؟ میں کہ ہر روز تین گھنٹے اپنے کھیت میں کام کرتی ہوں اور اس میں پودے لگاتی ہوں۔ میں کسی سے کچھ نہیں مانگتی، دعا تک نہیں مانگتی۔ ہمیں جو کچھ چاہیئے ہوتا ہے اپنے زورِ بازو سے حاصل کر لیتے ہیں۔"

یہ ایک ایسی قوم کی بچی تھی جس قوم نے اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے بدل ڈالی۔ ہم کہ ایسی غیرت مند قوم نہیں بنا سکے۔ غریب بچے بغیر کسی جھجک کے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور ہم ۔۔۔۔۔ ہماری قوم کے کسی بچے یا بڑے کے ہاتھ میں ستارے نہیں ہیں۔ ہم کہ پچپن سال سے اپنے کشکول کے سہارے جیتے ہیں۔ ستارے تو محنت اور خودی کی آگہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

ہم کہ اپنا تن اور من دونوں ہی بیچ چکے ہیں!

سامنے ڈیش بورڈ پر دو گلاب مرجھائے ہوئے پڑے ہیں۔ یہ پھول مجھے نیٹ پاک اِن کے

بوڑھے مالی کی یاد دلاتے ہیں اوران دو گلابوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں، قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اس نے مجھے گلاب اس لئے نہیں دئے کہ خدانخواستہ وہ میری کسی ذاتی خوبی سے متاثر تھا یا اسے مجھ سے کوئی لگاؤ تھا۔ اس نے تو مجھے اس لئے پھول دئے کہ میں اس گاڑی میں بیٹھی ہوں، بہر حال میں اس مالی کی شکر گزار ہوں۔

سکھر سے صادق آباد کا راستہ بہت اچھا تھا سڑکیں ٹھیک تھیں۔ سکھر اور پنوں عاقل کے درمیان چند مٹی کے پہاڑ تھے جو پرانے سندھ کی یاد تازہ کرتے تھے ورنہ جی ٹی روڈ کے دونوں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ آم کے درختوں پر بور ہی بور تھا۔ اس کے علاوہ کھجور کے سینکڑوں درخت تھے۔ گنے کے کھیت تھے اور شعیب مجھے تسلی دیتے تھے کہ اب تو پنجاب آگیا ہے اب تو سڑکوں کی طرف سے کوئی پریشانی ہوگی ہی نہیں کہ اچانک سڑکیں خراب ہوگئیں۔ البتہ نظارہ پہلے سے زیادہ خوب صورت تھا۔ سندھ سے کہیں زیادہ سرسبز۔ آم کے پیڑ سندھ میں بھی تھے مگر یہاں زیادہ اچھے طریقے سے لگائے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کینو اور مالٹے کے باغات بھی شروع ہو گئے تھے۔ ہر قدم پر انڈسٹریز تھیں اور لوگ بھی کہیں زیادہ خوشحال تھے۔ آبادی بھی نزدیک نزدیک تھی، غرضیکہ اوور آل ایک تبدیلی تھی۔ ہم صادق آباد کے قریب ایک ٹیوب ویل کے پاس کھانے کے لئے رکے۔ میں نے گھر کے بنائے ہوئے پراٹھے آلو کی بھجیا اور تکّے نکالے۔ یہ پہلے سے طے تھا کہ راستے میں باہر کا کھانا قطعاً نہیں کھائیں گے۔ امریکہ اور کینیڈا میں سڑک پر ہر قسم کا کھانا مل جاتا ہے۔ مزہ کیسا بھی ہو مگر بیمار ہونے کا خدشہ نہیں ہوتا۔ میں نے کھانا کھول کر ڈگی پر رکھا۔ دور دور تک کائنات میں رنگ بھرنے والی مخلوق کام میں مصروف تھی۔ لال، پیلے، نیلے دوپٹے سبز کھیتوں میں واقعی رنگ بھر رہے تھے۔ میں اپنے ساتھ ٹیوب ویل کے ساتھ بہتے ہوئے نالے کے پانی کو دیکھتی ہوں۔ پانی میں مٹی کا رنگ شامل ہے۔ کھیتوں میں کسانوں اور ان کے بیوی بچوں کا لہو بھی شامل ہے۔ نزدیک سے گزرتے ہوئے مسافر ہمیں دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ چھوٹی سی لال اینٹوں سے بنی مسجد سے حی علی الفلاح کی آواز ابھرتی ہے۔ نہ جانے اس آواز میں کوئی اثر کیوں نہیں رہا اس کی تاثیر کہاں چلی گئی، فلاح کا راستہ ہم کہاں کھو بیٹھے ہیں اور جب میں ہم کا لفظ استعمال کرتی ہوں تو اس میں گاؤں کے یہ لوگ شامل نہیں، بیراج کا خیر محمد شامل نہیں اور نہ وہ مالی



بہاولپور



بہاولپور



بادشاہی مسجد لاہور



بادشاہی مسجد لاہور

شامل ہے۔ مجرم میں ہوں کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی فلاح کے راستے سے دور ہوں یا پھر مجرم وہ لوگ ہیں کہ اسمبلی کی سیٹوں پر بیٹھتے ہیں۔ اس کی تمام مراعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چیف منسٹری کرتے ہیں اور پھر بھی کہنا پڑتا ہے کے ''دیرازنوشہباز شریف اون دی روڈ فروم صادق آباد ٹو خانیوال۔'' اس سے پہلے کہ میں اور زیادہ سوچوں اور ان سوچوں میں کھو جاؤں کہ شعیب نے مجھے چونکا دیا۔ ''اینگر و یوریا کیسے بنتا ہے؟''

''پتہ نہیں!''

''ہوا کو مائع میں تبدیل کر کے اس سے نائٹروجن نکالی جاتی ہے اور پھر اس کو سوئی گیس سے گرم کر کے اس سے یوریا بنایا جاتا ہے، جو کھیتوں میں کھاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔''

میں نے اپنے خوابوں سے جاگ کر کہا!

''اچھا۔۔۔۔''

حیدرآباد سے صادق آباد تک ہمیں سڑکوں سے کوئی شکایت نہیں ہوئی، مگر اس کے بعد بھاولپور تک کافی پژمردہ رہے۔ ہم کہ بڑے نازاں تھے کہ بھئی کچھ نہیں تو کم از کم سڑکیں تو ہم نے بنالیں۔ کیا ہوا جو دبئ بنکاک اور ہانگ کانگ ہم سے بہت آگے نکل گئے۔ ہم صرف سڑکوں پر ہی خوش تھے، مگر کیا معلوم تھا کہ یہ خوشی اتنی ناپائیدار ہوگی۔ شام پانچ یا چھ بجے ہم بھاولپور پہنچے اور گیریسن میس میں ٹھہرے۔ کمرہ سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ فضاء میں ہلکی سی خنکی تھی۔ مگر خوشگوار محسوس ہوتی تھی۔ سارا دن گاڑی میں بیٹھ کر ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ کچھ واک کی جائے۔ واپس آکر ٹی وی دیکھا۔ ٹی وی کے اُس پروگرام میں ایک لڑکی نے جاوید جبار سے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ ہم لوگوں میں ٹولرینس کیوں نہیں رہا۔

جاوید جبار

جاوید جبار نے اس سوال کا جواب یوں شروع کیا!

''معاف فرمایئے! میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔''

میں نے سوچا عجیب آدمی ہے۔ کیا اس نے کراچی میں لوگوں کو ہارن بجاتے نہیں دیکھا۔ ذرا جو صبر و تحمل ہو۔ لیکن جب میں بڑے کینوس پر دیکھتی ہوں تو ٹولرینس کا مظاہرہ جو میں نے جی ٹی روڈ پر

دیکھا وہ قابل ستائش تھا۔ اس تین دن میں ہر شخص نے ہمیں آرام سے راستہ دیا۔ خاص طور پر ٹرک والوں نے بڑی اچھی طرح اوورٹیک کرنے کا راستہ دیا اور کسی نے ہارن نہیں بجایا۔ جس سے بھی بات کی اس نے بڑی سہولت سے ہماری بات کا جواب دیا۔ ٹولرینس کا فقدان تو ہم میں ہے جو خود کو ہر غریب کا آقا سمجھتے ہیں۔ اسی فرعونیت نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ میں کہ جب پجیرو میں بیٹھتی ہوں تو سمجھتی ہوں کہ مجھے ہر چھوٹی گاڑی کو روند دینے کا حق ہے۔ اگر میں وڈیرہ ہوں تو سب میرے ہاری ہیں۔ اگر میں گورنر یا چیف منسٹر ہوں تو مجھ سے زیادہ دانا کوئی نہیں، اور اگر جنرل ہوں تو پھر تو بقیہ لوگوں کو کوئی الگ رائے رکھنے کا حق ہی نہیں ہے،۔ منٹوں میں ہم سب لوگوں کی تقدیر بدل سکتے ہیں، مگر افسوس کہ سڑکیں نہیں بنا سکتے۔ خاص طور پر وہ سڑکیں جو ہمارے گھروں تک نہیں جاتیں۔ مثلاً ہری پور سے اسلام آباد کی سڑک دیکھیئے۔ لاڑکانہ سے گڑھی خدا بخش اور لاہور سے رائے ونڈ یا پھر لاہور کے بڑے علاقوں کی سڑکیں۔ بقیہ لوگ تو صرف یہی کہ سکتے ہیں کہ۔ انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ۔ کاش عام لوگوں کی راہوں پر بھی کوئی کہکشاں بکھیرنے والا آ جائے۔

ہم اگلے دن، چودہ مارچ کو صبح آٹھ بجے بھاولپور سے نکلے۔ بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔ جس سے سنا یہی سنا کہ بھئی واہ کیا بات ہے پنجاب کی سڑکوں کی۔۔ کیا کام کروایا ہے شہباز شریف نے۔۔۔ مگر بھاولپور اور لودھراں کے درمیان کوئی سڑک ہی نہیں تھی۔ ہم ایک کچی سڑک پر تھے جو دریا سے گزر رہی تھی۔ ایک تقویت تھی کہ سیدھے ہاتھ پر ایک عالی شان پل زیر تعمیر تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے اس سفر کے بعد خانیوال سے آگے شہباز شریف کی ہائی وے شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا مقابلہ کسی بھی بہترین سڑک سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی سڑک کے ایک طرف کچے گھر ہیں۔ خانہ بدوشوں کی جھگیاں ہیں۔ دھوپ سے تمتماتے ہوئے تانبے جیسے بدن ہیں۔ زندگی کی صعوبتوں سے جھکے ہوئے کبڑے جسم ہیں، جو اپنے چیتھڑوں کو بڑی احتیاط سے رسی پر سکھاتے ہیں۔ خانہ بدوشوں کے خیمے خوش رنگ ہیں اگر چہ وہ خوش نمائی بوسیدگی کو نہیں چھپا سکتی۔ سڑک پر بڑا سا سرخ رنگ کا سپریم چائے کا بورڈ ہے۔ یہی تو ہے اپنا پن! سڑک پر بڑا سا نیلا بورڈ ہے جو لاہور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کم از کم کہیں تو خوشحالی ہے واؤ (انگریزی والا) کیا سڑک ہے، کیا گیس اسٹیشنز ہیں۔ کاش!!! ایوب خان دارالخلافہ اسلام آباد نہ لے

جاتے تو ہم بھی کچھ مزے لوٹتے یا پھر ہمیں بھی ایک شہباز شریف ملتا جو کم از کم اپنے صوبے کے لئے تو کچھ کرتا۔

خانیوال سے چالیس میل کے بعد یہ ہائی وے ختم ہو جاتی ہے کہ بہر حال وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ صبر شکر کر کے ہم بھی ٹرکوں کے پیچھے لگ گئے سنگل روڈ جہاں بار بار گاڑی کے سڑک سے گرنے کا خطرہ رہتا تھا۔ ساہیوال تک سڑک کا یہی حال رہا۔ ساہیوال سے نکلتے ہی ایک اچھا سا رائل ریسٹورنٹ نظر آیا، اس کی لوکیشن، صاف ستھری بلڈنگ، اور باہر لان میں لگی ہوئی لال چھتریوں کے نیچے سفید کرسیوں نے ہمیں دعوت دی کہ ہم کچھ دیر سستا لیں۔ باہر مکھیاں تھیں اس لئے ہم نے اندر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اندر صاف ستھری جگہ پر چکن ہانڈی اور دال کھائی جو بے حد مزیدار تھی۔ "اور تم میری کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔" بس سے اترے ہوئے کچھ مسافر بھی وہاں کھانا کھا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان کی بس کے لئے اناؤنسمنٹ کی گئی کہ بس لاہور جانے کے لئے تیار ہے۔ ہوٹل میں سب کچھ بہت اچھا لگا صرف ایک بات کی شکایت ہے کہ نہ جانے کیوں ایسی جگہوں پر واش رومز پر توجہ نہیں دی جاتی۔ اگلے دو گھنٹے ہم پنجاب پر رشک کرتے ہوئے لاہور میں داخل ہوئے۔ دس محرم کی وجہ سے ملتان روڈ پر رش نہیں ملا اور ہم آرام سے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

لاہور! ایک ایسا شہر جس کا اپنا صدیوں پرانا کلچر ہے۔ عظیم عمارتوں کا شہر، جہاں مسجد وزیر علی خان ہے، جہاں نولکھا ہے، چوبرجی ہے۔ وہ لاہور جسکے بارہ دروازے ہوتے تھے اور ہر رات وہ دروازے بند کئے جاتے تھے۔ داتا صاحب کا شہر، مغلوں کا شہر، انارکلی اور ملکہ نور جہاں کا شہر۔ وہ شہر جس نے بڑے بڑے شہنشاہوں کو دیکھا ہے۔ بڑی بڑی جنگیں دیکھی ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کو دیکھا ہے، جس نے اس شہر کو بخشش کے طور پر رنجیت سنگھ کو دے دیا اور پھر انگریزوں نے اس پر حکومت کی اور آج زندہ دلان لاہور کا شہر۔

داتا کی بستی لاہور، وہ داتا صاحب جن کا اللہ تعالیٰ کے یہاں اثر و رسوخ اتنا زیادہ ہے کہ مستنصر حسین تارڑ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "ایک صاحبہ نے اپنے بیٹے کو مدینے سے فون کر کے کہا کہ ذرا داتا صاحب کے مزار پر دو بکرے چڑھا دینا انہیں شاید ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ داتا

صاحب کی مہر کے بغیران کی دعا عرش سے ٹکرا کر واپس آجائے۔" وہ داتا صاحب جن کے لئے ملک کے وزیر اعظم نے اپنے ہاتھ سے سونے کا دروازہ لگوایا، وہ داتا صاحب جن کے یہاں ہر روز ہزاروں بھوکوں کا پیٹ بھرا جاتا ہے، وہ داتا صاحب جن کا دروازہ فقیر اور بادشاہ سب کے لئے کھلا ہے اور جہاں تک داتا صاحب کی بساط ہے وہ سب کی پرچیاں اوپر تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب یہ اوپر والے پر ہے کہ وتعزمن تشاوتزل من تشا۔

وہ لاہور شہر جہاں سے پانچ صدی پہلے شہزادہ سلیم نے اپنے ماموں کے ساتھ مل کر شہنشاہ اکبر کے خلاف جنگ کی۔ دیکھا جائے تو عورت کا فیملی پولیٹکس کے علاوہ باہر بھی کافی حصہ رہا ہے۔ وہ بھائی جس کے لئے مائیں بچپن سے اپنے بچوں کو برین واش کرتی ہیں کہ ماموں کے پیار سے بڑھ کر کوئی پیار نہیں۔ ماموں کے پیار میں اتنی ٹھنڈک ہوتی ہے کہ اس پیار دینے والے کا نام ہی چندا ماموں پڑ جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جودھا بائی کے بیٹے نے اپنے چندا ماموں کے ساتھ مل کر اپنے سلطان باپ سے بغاوت کی۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ صرف ہندو مسلمان اور طاقت حاصل کر لینے کی جنگ تھی۔ جہانگیر کا عالی شان مقبرہ جو ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، لگتا ہے کہ جہانگیر کی تمام کہانیاں زندگی اور موت سب یہیں بکھری پڑی ہے۔ سلیم کی محبوبہ انارکلی کا شہر، ایک غریب اور معصوم محبت جو شہنشاہ اکبر کی نظر ہو گئی مگر زندہ دفن کئے جانے کے باوجود وہ آج تک زندہ ہے۔ سلیم کی بے تاج ملکہ جس کے نام پر رکھا گیا انارکلی بازار جو لاکھوں دوشیزاؤں کی کلائیوں میں سہاگ کی چوڑیاں پہنا چکا ہے، مگر انارکلی کی کلائیاں آج بھی سہاگ کی خوشبو کو ترستی ہیں۔ (اگرچہ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک من گھڑت کہانی ہے۔)

ملکہ نور جہاں کا شہر جس نے زندگی بھر شہزادہ سلیم کے دل اور دماغ پر اور پس پردہ پورے ہندوستان پر حکومت کی، مگر آج ریلوے لائن کے ساتھ گوشہ نشیں ہے اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہے اور عظیم ہے لاہور کی سرزمین کہ اس نے انارکلی اور نور جہاں دونوں کو اپنے سینے میں سمو رکھا ہے۔

لاہور! جہاں وہ قلعہ ہے جس سے مینارِ پاکستان کے شیدائیوں کے کراہنے کی آوازیں آتی ہیں۔ ایک طرف بادشاہی مسجد سے حی علی الفلاح کی آواز گونجتی ہے تو دوسری طرف جسم کو داغنے کی چیخ و پکار ہے۔ قرارداد پاکستان کا مینار پاکستان، مال روڈ کا گورنر ہاؤس اور ہر طرف قرارداد پاکستان کا پاس نہ



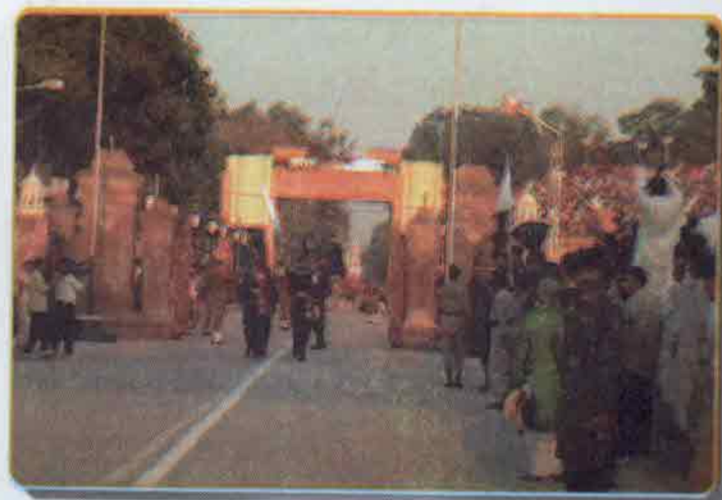
مینار پاکستان لاہور



لاہور قلعہ



واہگہ



واہگہ



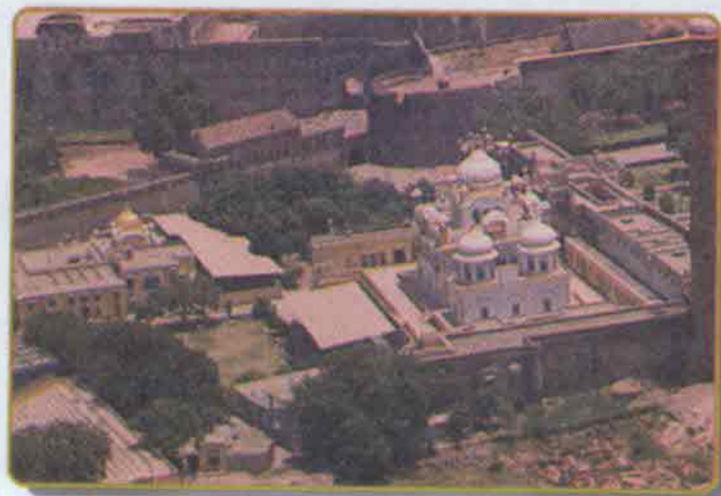
تقسیم ہند 1947 پینٹنگ



ہندوستانی سپاہی واہگہ



رنجیت سنگھ کا مقبرہ لاہور



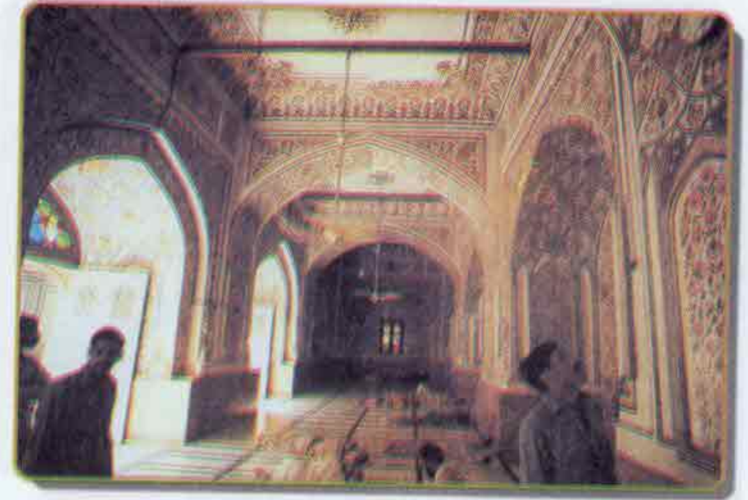
رنجیت سنگھ کا مقبرہ لاہور



دروازہ گلابی باغ لاہور



نور جہاں کا مقبرہ لاہور



شاہ جہاں مسجد



داتا دربار لاہور

رکھنے والے پاکستانی۔ لاہور کی وجہ شہرت۔۔۔۔ لاہوریوں کا دوستانہ رویہ، ان کی بے تکلفی، ہارس شو، ریڈ لائٹ ایریا، فوڈ سٹریٹ اور بسنت۔

لاہور کی ایک اور اہم جگہ انڈیا اور پاکستان کا بورڈ، واگہہ ہے۔ واگہہ جو لاہور سے پچیس کلو میٹر پر واقع ہے۔ وہاں ہر شام فلیگ لوورنگ سیریمونی ہوتی ہے، یعنی دونوں طرف کے جھنڈوں کو نیچے اتارا جاتا ہے اور دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ باقاعدہ پریڈ ہوتی ہے، اور دونوں طرف کے سویلین بھی یہاں موجود ہوتے ہیں جو ہاتھوں کے اشاروں سے اور زبان سے ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ کر دل کا بوجھ اتارتے ہیں۔ اگر ہاتھوں میں پتھر دے دئے جائیں تو شاید بالکل شیطان کو کنکریاں مارنے والا منظر ہو۔ اس شام کم از کم پانچ چھ سو پاکستانی وہاں موجود تھے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونجتی تھی۔ ہر طرف ملی نغموں کی آواز تھی، دوسری طرف بھی وہی عالم تھا۔

ہمارے فوجی نوجوان ملیشیا شلوار قمیص میں ملبوس تھے اور سر پر ایک شاندار طرہ تھا۔ دونوں ملک اس جگہ کے لئے خاص طور پر مضبوط اور قدآور جوانوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ پریڈ کے آخر میں دونوں طرف کے جوان ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں اور دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ منظر کافی روح پرور ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ پھر تقسیمِ ہند کا منظر آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ ایک بوڑھا شخص جو جھنڈا اٹھا کر اِدھر سے اُدھر گھوم رہا تھا میں نے اس کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ وہ اس نزدیک کے گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پاکستان کے لئے دعا گو تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ”آپ کو پاکستان سے کوئی امید ہے۔۔۔“ جواب ملا ”بالکل ہے۔ انشا اللہ پاکستان زندہ رہے گا۔۔“ میں تصویر کھنچوا کر آئی تو مہرین بولی، آپ اس سے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ ہوسکتا ہے وہ سی آئی اے کا یا ایف بی آئی کا آدمی ہو۔ کیا وقت ہے کہ ہر چیز پر شک کرنے کو جی چاہتا ہے۔

وی آئی پی کلچر یہاں بھی زوروں پر تھا، ایک تندرست سے صاحب نے فوجی جوان سے کچھ کہا جوان نے سیٹی بجا کر ان کو اور ان کے ساتھ آنے والی خواتین کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ ہم نے سوچا کہ شاید ہمیں بھی ان کے ساتھ اندر جانے دیں، مگر ان صاحب نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور ہمیں روک دیا گیا۔ عام لوگوں میں وہ شخص بھی تھا جس کی یادوں کے چراغاں نے ابھی بھی راہوں کو

روشن رکھا ہوا ہے۔ وہ صاحب پاکستان زندہ باد اور لا الہ الا للہ کے نعروں سے بہت جذباتی ہوگئے، تقسیم کے وقت کی یادوں نے انہیں بے چین کر دیا، وہ بتانے لگے کہ وہ بھی اسی جگہ سے پاکستان میں داخل ہوئے تھے، ایک جمِ غفیر تھا اور سب کھانے کو ترسے ہوئے تھے۔ یہاں کے شہریوں نے ان کا استقبال کیا تھا اور ہر طرف کھانے کی دیگیں کھول دی گئی تھیں۔ کیمپ کی دیکھ بھال کے لئے کمیٹیاں تھیں۔ ہمدرد لوگ تھے پچھلے دنوں کی صعوبتوں کے تمام آنسو دھل گئے تھے ایک روشن سحر کی تلاش نے دلوں کو گرما دیا تھا۔ ان کے دل میں آج بھی امید کی وہ مشعل روشن تھی، وہ اس آب وگل سے مایوس نہیں تھے، شاید ایسے ہی اوپٹی مسٹک (رجائیت پسند) لوگوں کی وجہ سے پاکستان قائم ہے۔ ؎ چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔ اگلی صبح ہم منگلا کی طرف روانہ ہوگئے۔

لاہور اور منگلا کے درمیان ہائی وے کے علاوہ دوسری سڑک بھی اتنی ہی اچھی ہے۔ صنعتی کارخانوں اور فیکٹریوں کا ایک جال ہے، ہرے بھرے کھیت ہیں۔ سکول ہیں، پکے اور صاف ستھرے گھر ہیں، گجرانوالہ ہے، سوہنی مہینوال کا چناب ہے، گجرات ہے اور کچے گھڑے ہیں جو آج کے سوہنی مہینوال کو عشق کی دعوت دیتے ہیں۔ وزیر آباد ہے جو اپنے سٹیل کی مصنوعات کے لئے مشہور ہے، اور میاں جی کی دال ہے کہ جی ٹی روڈ سے گزرنے والے اس کے خاص پراٹھے، دال اور ملائی سے ضرور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سنا ہے گوجرانوالہ میں صدر مشرف کی ایک دعوت میں میاں جی کو خاص طور پر ان کی دال کے ساتھ بلوایا گیا تھا اور میاں جی نے قطعاً یہ نہیں کہا تھا کہ یہ منہ اور مسور کی دال۔

لال اینٹوں اور سبز شیشوں والی ایک نئی اور خوشنما عمارت کے باہر ایک بورڈ لگا تھا

میاں جی ریسٹورنٹ۔۔۔ بلڈنگ کے بالکل اوپر اردو کا بورڈ آویزاں تھا جبکہ نیچے سنہری حروف سے انگریزی میں میاں جی ریسٹورنٹ کا بورڈ تھا۔ نئی عمارت کے ساتھ ایک چھوٹا سا تندور تھا جس میں اب صرف ڈرائیور کھانا کھاتے ہیں۔ باہر ایک درخت تھا جس پر یا اللہ کا ایک ٹین کا پرانا بورڈ تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ درخت جس پہ یہ بورڈ لگا تھا اس کی تین چھوٹی شاخیں بھی اللہ ہی کا لفظ بناتی ہیں۔ ہوسکتا ہے میاں جی نے کبھی پچیس تیس سال پہلے اسی پیڑ کے نیچے اپنا پہلا تندور جلایا ہو۔ پرانے اور چھوٹے ریسٹورنٹ پر پرانا بورڈ تھا! میاں جی دا ہوٹل۔ عام لوگوں میں یہ ریسٹورنٹ میاں جی کی دال کے

نام سے مشہور ہے۔ سنا ہے تندور کا آغاز صرف دال اور روٹی سے کیا گیا تھا۔ آج بھی میاں جی خود آکر دال میں تڑکہ لگاتے ہیں اور خود کرچھا چلاتے ہیں۔ میاں جی لالہ موسیٰ کے رہنے والے ہیں، نیا ماڈرن ہوٹل صرف ایک سال پرانا ہے۔ پرانے ہوٹل میں چھ بڑے بڑے دیگچے تھے۔ دو تین لوگ کھانا نکالنے میں مصروف تھے، پرانی کرسیاں اور میزیں تھیں ڈرائیور حضرات کھانا کھا کر ٹانگیں پسارے عیش کے مزے لوٹتے تھے۔ چہروں پر آسودگی تھی اور کسی عمل میں کوئی ہچکچاہٹ یا بناوٹ نہیں تھی۔ یہ سب اس حال میں اتنے اچھے لگ رہے تھے، اور جی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں کسی فنشنگ سکول میں بھیجا جائے۔ پس منظر میں ریسٹورنٹ کی دیواروں پر ہر طرح کی عربی آیات ترجمے کے ساتھ لکھی گئی تھیں۔ مثلاً، اور تم کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ گناہوں کو چھوڑ دینے کی دعوت تھی، نماز پڑھنے کی ہدایت تھی اس وقت سے پہلے کہ تمہاری نماز پڑھی جائے، اللہ سے ڈرنے کا مشورہ تھا، دلوں کو پھیرنے والے سے دین پر پختہ اور ثابت قدم رکھنے کی دعا تھی۔ مگر وہ آیت جو سب سے زیادہ موزوں تھی، وہ تھی

"جو شخص ڈرتا رہے گا اللہ سے، پیدا کر دے گا اللہ اس کے لئے نکلنے کی کوئی راہ اور رزق دے گا ایسے طریقے سے جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔" اور نیچے لکھا تھا "اللہ تیرا شکر!"

کیا پتہ تھا میاں جی کو کہ وہ ایک دن ملک کے صدر کی دعوت پر بلائے جائیں گے۔ نئے ریسٹورنٹ میں بہت عمدہ فرنیچر تھا ایک بہت بڑا نقشین عمدہ جالی کے کام والا پارٹیشن تھا، جو ریسٹورنٹ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا۔ ایک حصہ فیملی کے ساتھ آنے والوں کے لئے تھا۔ ٹائلٹ صاف ستھرا تھا اور اس میں ٹھنڈا گرم دونوں طرح کا پانی موجود تھا۔ ریسٹورنٹ میں آئینوں سے مزین ستون تھے۔ میز پر سفید اور میرون رنگ کے میز پوش تھے۔ سفید شفاف پلیٹوں پر انگریزی میں نیلے رنگ سے میاں جی لکھا تھا اور اس کے بالکل نیچے بہت کیوٹ کانٹا چھری اور چمچ بنے تھے۔ ویٹرز کالی پتلون اور نیلی قمیص میں ملبوس تھے مینیجر صاحب براؤن پتلون اور پیچ قمیص پہنے بہت سمارٹ اور نمایاں نظر آتے تھے۔ وہ باری باری بڑی شائستگی سے سب سے آرڈر لیتے تھے۔ دن کے دو بجے تھے دیکھتے ہی دیکھتے تمام میزیں فل ہو چکی تھیں۔ ایک تین سالہ بچہ "چاول کھاؤں گا" کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ ہم نے دال کڑھائی، پراٹھا اور ملائی منگوائی۔ سب سے مزیدار پراٹھا اور ملائی تھی شاید صرف یہی دو چیزیں منگواتے تو کافی تھا۔ ہم کہ کراچی میں رہ کر

ملائی کا مزا ہی بھول گئے تھے۔ واہ کیا نعمت ہے۔ منہ میں ڈالتے ہی ایک شیرینی اور حلاوت سے منہ بند ہو گیا۔ میاں جی کو مزید دعا دی گئی بچا ہوا گوشت اور دال پیک کروایا اور ملائی پر فریفتہ وہاں سے چل دیئے۔ ریسٹورنٹ کے باہر ایک گفٹ شاپ تھی جو امریکہ کے کسی ہائی وے پر واقع دکان کی یاد دلاتی تھی۔ دکان میں پنجاب کی لوکل چیزوں کے علاوہ اور بھی ضرورت کی چیزیں تھیں۔

اس جگہ سے آگے کھاریاں تھا۔ آج سے پنتیس سال پہلے ہم یہاں بھی آئے تھے۔ واپسی پر ایک جگہ ریلوے گیٹ بند ملا۔ سڑک بالکل سونی تھی۔ ہم اطمینان سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہنی مون پیریڈ ابھی جاری تھا۔ ٹرین آئی اور چلی بھی گئی اچانک ایک گاڑی کے ہارن نے چونکایا۔ گاڑی والے نے کہا'' بھائی بقیہ رومینس گھر جا کر کرنا۔'' یہ واقعہ ہے اُس وقت کا، جب آتش جوان تھا۔ اِس وقت تو میاں جی کی ملائی کا ایسا نشہ تھا کہ کسی بستر کی تلاش تھی۔

وہ رات ہم نے کور کمانڈر کے گھر میں گزاری کہ لیفٹنٹ جنرل جاوید عالم، شعیب عالم کے بھائی ہیں۔ اگلی صبح ہم روہتاس کا قلعہ دیکھنے کے لئے گئے۔

مین جی ٹی روڈ پر لاہور سے آتے ہوئے دینہ کے نزدیک ''روہتاس- آٹھ کلومیٹر'' کا ایک بورڈ لگا ہے۔ ایک خاموش سی سڑک ہے جس پر ایک مزار ہے اور چند چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانات ہیں جو آپ کو اس پر ہیبت قلعہ کی طرف لے جاتے ہیں، جسے رہتاس کہتے ہیں۔ ساڑھے پانچ سو سالہ پرانا یہ قلعہ جو آج بھی پُرشکوہ انداز میں ایک سپہ سالار شیر شاہ سوری کی یاد دلاتا ہے۔ ایک ایسا مقام، ایک ایسی گزرگاہ جس نے محمود غزنوی بت شکن کا جاہ وجلال دیکھا ہے، ہمایوں کی فاتحانہ واپسی دیکھی ہے، جس نے سکندر اعظم جیسے جرنیل کو گزرتے دیکھا ہے، الغرض اس تاریخی نالے گھان نے غزنی کابل اور ثمر قند سے آنے والے دیگر کئی جنگجوؤں کے ہند پر حملہ آور ہونے اور کامیاب واپس لوٹنے کا منظر بارہا دیکھا ہے، مگر فرید خان جو بعد کو شیر شاہ سوری کہلایا اس کی دُوررَس ذہانت اور جنگی مہارت نے اس قلعے کی بنیاد رکھی۔ روہتاس کا ایک مطلب ندی کے کنارے ہے۔ اس کا ایک اور مطلب ہموار پہاڑی میدان بھی ہے۔ قلعہ روہتاس کی بنیاد ۱۵ مئی ۱۵۴۱ء بروز اتوار رکھی گئی۔ یہ قلعہ چار سال سات ماہ اور اکیس دن میں مکمل ہوا۔ اس کی تعمیر میں کم وبیش تین لاکھ افراد نے حصہ لیا۔ قلعہ روہتاس کی تعمیر کا ایک



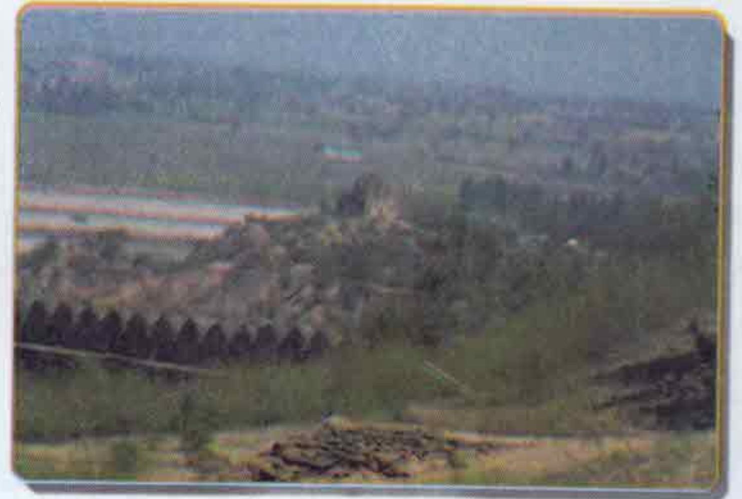
روہتاس



روہتاس



روہتاس



روہتاس

مقصد تو یہ تھا کہ ہمایوں کی واپسی کا راستہ مسدود ہو جائے اور دوسرا یہ کہ مغلوں کے وفادار گکھڑوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ قلعہ روہتاس میں شاہی محل، رانی کا محل، لنگر خانہ، شیشی دروازہ، کابلی دروازہ، طلاقی دروازہ، شاہی مسجد، چاندولی دروازہ، دو باولیاں، اور ایک پھانسی خانہ اور شیر پنجرہ ہے۔ قلعہ روہتاس میں بارہ دروازے، اڑسٹھ برج، اٹھارہ ہزار آٹھ سو چھپن کنگورے اور ساڑھے آٹھ ہزار سیڑھیاں ہیں فصیل کی مجموعی طوالت بارہ میل کے لگ بھگ ہوگی۔ بیرونی حملہ آوروں سے نپٹنے کے لئے تین ہزار سوار، پچپن پیادے اور تقریباً پانچ سو توپیں ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

اس قلعے کی تعمیر سے آج بھی بنانے والے کی ذہانت اور شان و شوکت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذہانت جو زندگی اور تاریخ کے ہر موڑ پر کام آتی ہے۔ شیر شاہ سوری نے تین لاکھ لوگوں کی مدد سے صدیوں پہلے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا اور ہم نے اپنی لاپرواہی سے اتنے بڑے عجوبے کو دنیا تو دنیا خود اپنی نظروں سے بھی چھپا کر رکھا ہے۔

ہم کافی پہلے امریکہ میں ایک جگہ لوسیانا گئے تھے، لوسیانا سویمپ، وہاں ہم نے ایک کشتی میں دریا کا ٹور لیا۔ اس ٹور کا گائیڈ بولنے میں بلکہ قلابیں مارنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اس ٹور کے بارے میں اتنی تمہید باندھی کہ لگتا تھا کہ آج نہ جانے کون کون سے طلسم ہم پر آشکار ہو جائیں گے، نہ جانے کتنی وائلڈ لائف ہماری منتظر ہے۔ مگر آخر میں ہوا یہ کہ ہم صرف ایک چوہا اور ایک کوا دیکھ سکے۔ اور اس ایک کوے اور ایک چوہے کی تصویر لینے کے لئے نہ جانے کتنے فلیش لائٹ والے کیمروں کی روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ لوگ دوربینیں لگا لگا کر اس چوہے اور کوے کو ڈھونڈتے تھے اور نظر آنے پر خوشی سے تالیاں بجاتے تھے۔ میرے بیٹے ناصر نے مجھ سے کہا: امی اگر ان کے پاس ہاتھی ہوتا تو معلوم نہیں یہ لوگ کیا کرتے؛ دوسری طرف ہمارے پاس یہ قلعہ اس ویرانے میں محو خواب ہے۔ مگر شاید قوموں کی طرح عمارتوں کی بھی قسمت ہوتی ہے۔ ابھی تک اس قلعے کو جگانے والا پیدا نہیں ہوا۔ بدقسمتی ہے روہتاس کی کہ وہ ہم جیسی قوم کے حصے میں آیا ہے۔ ہم کہ خود اپنی صلاحیتوں، اپنے کارناموں سے نا آشنا ہیں۔

تاریخ میں جہاں بھی دیکھیں شاہی اور فقیری ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ روہتاس کے دامن میں

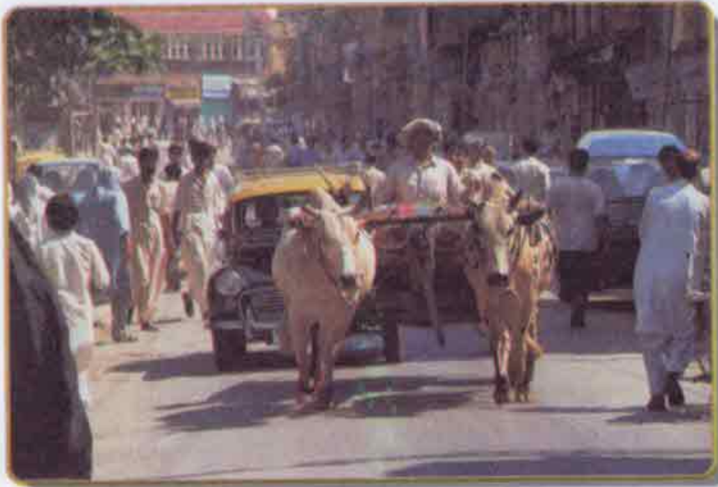
بھی اس داخلی دروازے کے ساتھ جہاں سے شیر شاہ سوری داخل ہوتا تھا، ایک فقیر ولی اللہ کی قبر ہے۔ کچی دیواروں کا مزار، جس پر بہت سے رنگوں کے بوسیدہ جھنڈے لہراتے ہیں۔ انہیں کے نام پر اس دروازے کا نام چاندولی رکھا گیا ہے۔ تیس فٹ بلند دروازہ اگرچہ شکستہ ہے مگر پھر بھی دروازے کا شاہانہ پن اور فقیر کی بے نیازی ایک حقیقت کو آشکار کرتی ہے۔ سنا ہے یہ بزرگ بہت عرصہ جگہ جگہ شیر شاہ کے ساتھ ساتھ رہے۔ جب شیر شاہ نے اپنے شاہانہ انداز میں پوچھا کہ "مانگ کیا مانگتا ہے" تو انہوں نے کہا کہ "میرا مزار تمہارے اس قلعے کے شاہی دروازے کے سامنے ہوگا۔" عدالتی کمرے کے سامنے پھانسی خانہ ہے، جس کے بالکل نیچے ایک شیر کا پنجرہ ہے۔ گائیڈ کی کہانی کو اور بھی خوفناک بناتی ہے کہ پھانسی کے بعد لاش بھوکے شیر کے پنجرے میں گر جاتی تھی اور بقیہ فیصلہ شیر کر دیتا تھا۔ اس قلعے میں تین گنبد والی ایک مسجد ہے۔ دروازوں پر اللہ اور محمد ﷺ درج ہے اور اندر کلمہ طیبہ لکھا ہے۔ خدا جانے اس مسجد میں کب سے اذان کی آواز نہیں گونجی۔ گائیڈ کا کہنا تھا کہ بارہ دروازوں کے لئے اس میں چوبیس شیر رکھے جاتے تھے، جو برے وقتوں میں دروازوں کی حفاظت کرتے تھے۔

روہتاس کا قلعہ ہمیشہ سے بدقسمتی کا شکار رہا۔ یہ کبھی بھی مغلوں کی پسندیدہ جگہ نہیں رہی۔ شہنشاہ اکبر صرف ایک مرتبہ یہاں ٹھہرے اور جہانگیر تین یا چار مرتبہ شکار کے لئے یہاں رکا۔ کبھی شیر شاہ کی آمد پر یہاں نقاروں کی آواز گونجتی تھی۔ بگل بجتے تھے، لیکن آج یہاں خاموشی ہے۔ فوجی فاؤنڈیشن کالج کی بچیاں جو یہاں پکنک منانے آئی ہیں، سفید یونیفارم پہنے رانی محل میں گھومتی ہیں۔ شیر پنجرے اور پھانسی خانے میں جا کر چیخیں مارتی ہیں اور پھر ہنستی ہوئی مان سنگھ کے محل میں، اس کے تخلیے میں مخل ہوتی ہیں۔ باہر تیز دھوپ سے چند سوکھے ہوئے خودرو درخت ہیں اور دور تک پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیت ہیں۔ ایک اینٹوں کی بھٹی ہے اور دور شیر شاہ کا بنایا ہوا چھوٹا سا پل ہے اور وقت کے ہاتھوں روہتاس کی سیاہ ہوتی فصیلیں ہیں۔ دھوپ بہت تیز ہو چکی ہے اور اکیسویں صدی کا مجھ جیسا شخص شیر شاہ کے سپاہی کی طرح روہتاس کی فصیل پر زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا۔ میں گاڑی میں بیٹھ جاتی ہوں اور پیپسی کا کین کھولتی ہوں۔

ہم ایک اور دن منگلا میں گزارتے ہیں اور پھر پنڈی سے ہوتے ہوئے پشاور کی طرف روانہ



میاں جی ریسٹورنٹ



راولپنڈی



اسلام آباد



فیصل مسجد اسلام آباد

ہو جاتے ہیں۔ہم نے شادی کے فوراً بعد کافی عرصہ پشاور میں گزارا تھا۔وہ زمانہ جب بچے بہت چھوٹے تھے۔جس طرح بادشاہوں کا سنہری دور ہوتا ہے، اسی طرح میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ ہمارا سنہرا دور تھا، جب بچے چھوٹے تھے۔ یادوں کا ایک جمگھٹا ہے، ایک فصل گل ہے جس نے یادوں کا مے خانہ سجا رکھا ہے۔ یوں تو ہم ہر روز ہی ماضی کی گزرگاہوں سے گاہے بگاہے گزرتے ہی رہتے ہیں کہ دراصل ماضی ایک رابطہ ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ہم ایک خالی سلیٹ کی طرح ہیں۔ اگر پیچھے کچھ نہیں ہے تو سامنے ایک اندھیرا ہے جو آگے بڑھنے کی راہوں کو مسدود کر دیتا ہے۔ مگر کتنا ظلم ہے کہ پیچھے مڑ کر آپ صرف دیکھ سکتے ہیں ان راہوں پر دوبارہ مڑ کر جا نہیں سکتے۔ مگر پھر بھی یہی ہمارا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ میں پنڈی سے پشاور جاتے ہوئے ٹیکسلا کی سڑک سے گزرتی ہوں۔ ٹیکسلا جو اپنے آثار قدیمہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ میرا آثار قدیمہ صرف اکتیس سال پرانا ہے۔ ہم ۱۹۷۲ میں ٹیکسلا کا میوزیم دیکھ کر نکلے تو سڑک بن رہی تھی ٹریفک آہستہ ہوگئی، مزدور ہاتھوں سے پتھر توڑ رہے تھے۔ میرے بیٹے عامر نے بزجستگی سے پوچھا! ''کیا یہ ٹیکسلا کے لئے چیزیں بنا رہے ہیں؟''

ہمارے بائیں طرف نکلسن کا مونیومنٹ ہے اور اس کے دوسری طرف ہماری سڑک کے متوازی شیر شاہ سوری کی گرینڈ ٹرنک روڈ ہے۔ وہ سڑک جو کلکتہ سے کابل تک جاتی تھی جس کے ہر چار کوس پر ایک کنواں تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر غاریں بنائی گئی ہیں جو لوگوں کی رہائش گاہیں ہیں۔ تھوڑا سا آگے دائیں ہاتھ پر گرونانک صاحب کا پنجہ ہے وہ گرونانک صاحب جو مکہ بھی گئے تھے۔ وہ بزرگ کہ جن کے پنجے کے اشارے پر پہاڑ رک گیا تھا۔ کراچی میں عبداللہ شاہ غازیؒ کے اشارے پر سمندر رک گیا تھا۔ ایسے معجزات اور واقعات ہر تہذیب اور ہر مذہب کو دلچسپ بناتے ہیں۔ خدا جانے آج کل ایسے معجزات کیوں نہیں ہوتے۔ کوئی ابابیلیں امریکہ سے عراق تک کے راستوں کو کیوں تاریک نہیں کر دیتیں۔ کوئی یدِ بیضا ایک نیا راستہ کیوں نہیں بنا دیتا اور دشمن کی راہوں کو کیوں مسدود نہیں کر دیتا۔ کوئی کوہِ طور آنکھوں کو خیرہ کیوں نہیں کرتا، لیکن شاید۔۔۔۔ ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں۔

بعض مرتبہ ایسا لگتا ہے کہ شاید اللہ تعالے کا پیچ ورک ڈیزائن اتنا پیچیدہ ہو چکا ہے کہ وہ خود گھبرا کر اس کو چھوڑ چکا ہے۔ اب دیکھیں اس کے بندے، اسکے ٹرینڈ کئے ہوئے یہ ملازم اس پیچ ورک

ڈیزائن میں کون کون سی خون کی ندیاں بہا کر اس کائنات کو مزید رنگین کرتے ہیں۔ تاریخ میں اگر انسانی فرعونیت کی یہ گل کاریاں نہ ہوں تو شاید آدم کی یہ کہانی بڑی خشک ہو جائے۔ اگر تاریخ میں کوئی بش نہ ہو کوئی صدام نہ ہو، کوئی کولن پاول نہ ہو، کوئی پھانسی خانہ نہ ہو، ہاتھی والوں کی بدمستیاں نہ ہوں تو کہانی آگے کیسے چلے۔ یہ اور بات ہے کہ اس دور میں صرف ہاتھی والے ہیں اور ان کی بدمستیاں ہیں کوئی معجزہ نہیں، خاص طور پر ہم کہ صرف معجزوں کے منتظر رہتے ہیں۔ امیر مسلم ممالک اپنا پیسہ اور ہم جیسے غریب ملک اپنے ذہن مغرب میں گروی رکھ چکے ہیں۔ سود اتنا بڑھ چکا ہے کہ اصل کی واپسی کی کوئی امید نہیں۔ عزت نفس ویرانی کے کھنڈرات میں بھٹکتی ہے۔ خوف مصلحت اور خود غرضی نے انسان کو سجدہ ریز کر کے تاریخ کے اوراق کی سیاہی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

جیسے جیسے آپ پشاور کی طرف بڑھتے ہیں، پہاڑوں کی شادابی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ہرے جھنڈوں کے چھوٹے بڑے مزار ہیں۔ بائیں ہاتھ پر اٹک کا قلعہ ہے۔ نیچے دریائے سندھ بہتا ہے اور یہ وہ جگہ جہاں دریائے کابل اور سندھ کا ملاپ ہوتا ہے۔ دونوں کے پانی کی رنگت کا نمایاں فرق ہے۔ کابل کا پانی براؤن ہے اور سندھ کا رنگ سبز ہے۔ ہم کیونکہ نئے پل سے جا رہے ہیں اس لئے اٹک کے قلعے کے ساتھ سے نہیں گزرتے۔ نیا پل قلعے سے پہلے سیدھے ہاتھ پر مڑ جاتا ہے۔ پشاور جانے والی سڑک پر دریائے کابل ہمارے ساتھ ہے۔ قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ لباس اور چہروں میں بھی تبدیلی ہوتی نظر آتی ہے۔ دریائے کابل کے کنارے تمام عورتیں اچانک چادروں کے پردوں میں لپٹ جاتی ہیں۔ مدرسے اور سکول پنجاب سے بھی زیادہ ہیں۔ سب سے زیادہ پسماندگی سندھ میں ہی نظر آتی ہے۔ جہاں تک انڈسٹریز کا تعلق ہے، پنجاب اور سرحد دونوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ سڑک پر ایسے لوگ نظر نہیں آتے جن کے پاؤں میں جوتا نہ ہو۔ جب کہ سندھ میں ایسے بچے اور عورتیں بکثرت نظر آئے جو ننگے پیر تھے۔ ماربل، سیمنٹ، ٹائلز اور ٹوبیکو کی فیکٹریز ہیں۔

اور پھر اکوڑہ خٹک جو اسلامی مدارس کا بہت بڑا مرکز ہے۔ بہت سے طالبان نے یہاں کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ جامعہ ابوہریرہ، جامعہ تحصیل القرآن، اسلامیہ پبلک سکول اور نہ جانے



بالا حصار قلعہ پشاور



قصہ خوانی بازار پشاور



قلعہء جمرود



خیبر پاس

کیا کیا۔ لگتا ہے آپ کسی اسلامی یونیورسٹی میں داخل ہو گئے ہیں۔ تعلیم کہ جس میں اتنی طاقت ہے کہ نسلوں کے ذہنوں کو گرفت میں لے کر کسی طرف بھی ان کا رخ موڑ سکتی ہے۔ ایمان کی طاقت نے صرف مساجد ہی نہیں شہیدوں کے قبرستان بھی سجا دیئے۔ عقل اور دل کی جنگ میں دل کی جیت ہوئی اور لوگ جوق در جوق بغیر کسی فوجی ٹریننگ کے افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ مدارس کے علاوہ سٹی سکول کی بھی کئی عمارات نظر آئیں۔ آرٹلری اور آرمرڈ کور کا سکول، ہندوستان کا ٹینک سڑک کے دائیں طرف شکست کا نشان اپنے سینے پر سجائے کھڑا ہے۔ بائیں طرف قاضی حسین احمد کا بڑا سا بورڈ! ہمارا انتخابی نشان کتاب۔ یہاں سے گزرتے ہوئے میں بھی اپنا دوپٹہ پھیلا کر اوڑھ لیتی ہوں کہ یہاں ہر عورت کی یا تو صرف آنکھیں نظر آتی ہیں یا پھر وہ برقعوں میں ملبوس ہیں۔ ایک طرف لوکوموٹیو فیکٹری اور دوسری طرف پل کے نیچے ایک بہت بڑی بکرا منڈی۔ حرکت المجاہدین کے بورڈ ہیں اور یقیناً سندھ اور پنجاب سے بالکل مختلف کلچر ہے۔ پشاور میں داخل ہوتے ہی سب سے نمایاں چیز پولیس سروس کا وُنٹر کی عمارت ہے اور پھر بالا حصار کا قلعہ، جس کی غلام گردش کے داخلی دروازے سے ہوتے ہوئے ہم بالا حصار کے قلعے میں داخل ہوتے ہیں۔ ہر قلعے کا ایک اپنا ماحول اور اپنا کیریکٹر ہوتا ہے۔ اس قلعے میں وہ پُر اسراریت اور دہشت نہیں جو روہتاس میں محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ قلعہ جگہ کے لحاظ سے، فوجی نوعیت اور تعمیر کے لحاظ سے، بہت سوچ سمجھ کر بنایا گیا تھا مگر کیا کبھی یہ قلعہ کسی حملہ آور کو روک پایا؟

اس قلعے نے بہت سے جنگجوؤں فاتح اور بادشاہوں کو دیکھا ہے۔ اس کو بہت مرتبہ فتح کیا گیا اور بہت مرتبہ اجاڑا گیا۔ اس وقت آپ کو یہ جس حالت میں نظر آتا ہے، اس کا سہرا انگریزوں کو جاتا ہے اور اب انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کور کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ قلعہ تقریباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ پشاور شہر، اور اس کی تاریخ دو سے ڈھائی ہزار سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ ''بالا حصار'' فارسی لفظ ہے، جس کا مطلب ''اونچی جگہ'' ہے۔ اس کا یہ نام افغان بادشاہ تیمور شاہ درانی نے رکھا تھا۔ یہ قلعہ پشاور کے مغربی کونے پر واقع ہے۔ ایک زمانے میں یہ شہر سے دور تھا مگر اب شہر میں نئی عمارتوں کے بننے سے یہ شہر کا ایک حصہ بن گیا ہے۔

۹۸۸ عیسوی میں سبکتگین اپنے دس ہزار گھوڑوں کے ساتھ یہاں ٹھہرا تھا۔ محمود غزنوی نے راجہ جے پال اور آنند پال کو یہاں شکست دی۔ شہنشاہ بابر یہاں ٹھہرا، اور پھر ہمایوں نے نہ صرف یہاں

قیام کیا بلکہ اس کی دوبارہ تعمیر کی۔ ۱۵۸۵ء میں بالا حصار میں ایک بڑی آگ لگی، جس کے نتیجے میں ایک ہزار اونٹ اور تجارت کا سامان تباہ ہو گیا۔ راجہ مان سنگھ بھی اپنی فوج کے ساتھ یہاں ٹھہرا۔ نادر شاہ خیبر پاس سے داخل ہوا، اس علاقے کو فتح کیا اور پھر یہ جگہ عدالت اور گورنر ہاؤس کے طور پر استعمال ہوئی۔ اس کے بعد یہ تیمور شاہ درانی کا محل بنا۔ ۱۸۰۹ء میں مونٹ سٹورٹ الفنسٹن کابل کے دربار میں آیا تو اس کے مطابق یہاں پر ایک شالیمار گارڈن تھا۔ اس نے ایک جگہ اس دربار کا ذکر کیا ہے جو اس قلعے میں واقع تھا۔ اس نے جس طرح بادشاہ کے ہیرے جواہرات، موتیوں کے تخت، بادشاہ کی پوشاک اور اس کے دبدبہ کا ذکر کیا ہے اور اس قلعے کے باغات کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس حکومت کے عروج کا زمانہ تھا۔ درانی بادشاہت کے بعد اس کی جگہ سکھوں نے لے لی۔ سکھوں نے بالا حصار کو تباہ کیا اور پھر اس کو دوبارہ تعمیر بھی کیا۔ اس لڑائی میں ہری سنگھ نلوہ بھی شامل تھا، وہ ہری سنگھ کہ سنا ہے جس کے نام سے آج بھی مائیں بچوں کو ڈراتی ہیں۔ آخر کار سکھوں کا زمانہ بھی ختم ہوا اور انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اس زمانے میں بالا حصار کی دیواریں مٹی اور گارے کی تھیں اور قلعہ اتنا مضبوط نہ تھا۔ انگریزوں نے اسے دوبارہ تعمیر کیا اور یہ ایک مرتبہ پھر فوجی مرکز بن گیا۔

موجودہ بالا حصار ایک غیر معمولی عمارت ہے، جس میں اندرونی اور بیرونی دیواریں ایک بھول بھلیاں کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ دیواریں لال اینٹوں کی بنائی گئی ہیں۔ اندرونی دیوار پچاس فٹ بلند ہے، جو اونچائی میں بیرونی دیوار سے دُگنی ہے۔ قلعے کی پوری اونچائی بانوے فٹ ہے۔ اس کا رقبہ پندرہ اعشاریہ چار ہے۔ ایک پکی سڑک آپ کو غلام گردشوں سے گزارتی ہوئی اوپر تک لے جاتی ہے۔ اس قلعے میں دو مزار ہیں۔ حافظ مستان شاہ کا مزار جو جنوبی دیوار کے ساتھ ہے اور ہر جمعرات کو لوگ اس پر فاتحہ پڑھنے آتے ہیں۔ دوسرا مزار سید سبز پیر شاہ بخاری کا ہے، جو مغربی دیوار کے ساتھ ہے۔ پہلے مزار کے ساتھ ایک کنواں ہے جو ایک سو بیس فٹ گہرا ہے

غلام گردشوں سے گزرتے ہوئے ہم صاف ستھری سڑک پر اوپر کی طرف چلتے گئے اور پھر ہم میجر جنرل حامد صاحب کے آفس کے سامنے رک گئے۔ منظر بدل چکا تھا۔ ہر طرف خاکی شلوار قمیص میں ملبوس نوجوان تھے۔ میجر جنرل صاحب کا آفس خود ان ہی کی طرح باوقار اور متاثر کر دینے والا تھا۔

چمکتا ہوا ماربل کا صاف ستھرا فرش اور اس پر بھاری فرنیچر تھا۔ ایک طرف ایک صوفہ سیٹ تھا۔ ایک دیوار پر قائداعظم کی بڑی سی تصویر تھی اور دوسری دیوار پر جنرل پرویز مشرف تھے۔ دیوار پر ایک بورڈ تھا، جس پر تقریباً بیسویں صدی کے ان تمام لوگوں کے نام تھے جو آئی جی ایف سی رہ چکے ہیں۔ سب سے پہلا پاکستانی بریگیڈیر احمد جان تھا۔ میجر جنرل حامد بھی خاکی یونیفارم اور پشاوری چپل میں بہت سمارٹ لگ رہے تھے۔ یونیفارم کا بھی ایک اپنا رعب ہوتا ہے کہ سامنے بیٹھے شخص کا کونفیڈنس خود ہی کم ہونے لگتا ہے۔ جنرل صاحب نے ہمارے سفر کے بارے میں پوچھا اور پھر ایک جوان نے جو سفید قمیص شلوار اور سفید گلگتی ٹوپی پہنے تھا، ہمیں چائے پیش کی۔ اس نے سفید جوگرز پہنے تھے کہ اس کے پاؤں کی چاپ سنائی نہ دیتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جنرل حامد نے میجر الیاس کو بلوایا اور ان سے کہا کہ ہمیں بالا حصار کا ایک ٹور دے دیا جائے۔ ہم میجر صاحب کے ساتھ باہر آ گئے۔ باہر ہر طرف آرمی کے چاق و چوبند نوجوان اسی خاکی یونیفارم میں اس قلعے کو رونق بخشتے تھے۔ ایسے چہرے جو وقت کی گرد سے ابھی محفوظ ہیں ایسے چہرے جن کی معصومیت ابھی قائم و دائم ہے۔ جو سمجھتے ہیں کہ شاید پاکیزگی کی ایک کہکشاں ہے جو انہیں صراطِ مستقیم سے گزرتے ہوئے اوپر تک لے جائے گی۔ ابھی ان کی معصومیت حقیقت کے سمندر میں غرق نہیں ہوئی۔ تقریباً تمام نوجوان ہی میجر الیاس کی طرح خوبصورت تھے۔ جب سارے جہاں کی نعمتیں بانٹی جا رہی تھیں تو نہ جانے ہم کہاں تھے، ہمارے حصے کے ایسے جوان شاید جنت میں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میجر صاحب ہمیں اوپر کے لان میں لے گئے جہاں سے پورا شہر نظر آتا تھا۔ مسجد محبت خان تھی جو کبھی مغلوں کے ایک گورنر نے بنوائی تھی۔ دور ایک گھنٹہ گھر تھا جو اب وقت کے ہاتھوں وقت بتانے سے قاصر ہے۔ دور ایک سبز گنبد ہے اور پھر ہر طرف بکھرے ہوئے محلے ہیں۔ لان میں چھ نئے درخت ہیں، جو مختلف میجر جنرلس نے لگائے ہیں۔ ایک درخت پر وزیر داخلہ معین حیدر کا نام تھا۔ میجر الیاس کے لئے میرے سوالات کے جواب دینا آسان تھا مگر شعیب کے سوالات مشکل تھے۔ شعیب نے اسی ماحول میں پچیس سال گزارے ہیں، اس لئے ان کے سوالات فنی نوعیت کے تھے۔ میجر صاحب نے اس قلعے کی تاریخ ہمیں مختصر الفاظ میں بتائی اور پھر ایک کیپٹن کاشف کو ہمارے ساتھ کر دیا کہ وہ ہمارے بقیہ سفر میں ہماری رہبری کرے۔ اگلے آٹھ گھنٹے کیپٹن نے ہمارے ساتھ گزارے۔ اس

آٹھ گھنٹے میں جہاں ہم نے ان سے بہت معلومات حاصل کیں وہاں یقیناً اتنے گھنٹوں میں اس کی اپنی معلومات میں بھی شعیب کی وجہ سے کافی اضافہ ہوا ہوگا۔

پشاور سے جمرود کے راستے میں بہت سے مٹی کے میدان ہیں۔ یہاں پر ابھی کچھ عرصہ پہلے افغانیوں کے کیمپ تھے۔ اب ان کیمپس کو منہدم کر دیا گیا ہے اور کچی مٹی خود بخود بیٹھ گئی ہے۔ بائیں طرف اب بھی نیلے رنگ کے پلاسٹک کے پردے لگے کچھ کیمپ نظر آتے ہیں۔ باڑہ کے پاس ہر طرف اسلحے کی دکانیں ہیں، کبھی ہم لوگ خاص طور پر کپڑا اور روزمرہ کی دوسری چیزیں خریدنے باڑہ آیا کرتے تھے مگر آج تو سین ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر طرف کچھ اس طرح کے بورڈ تھے۔ افغان شاپنگ سنٹر، کابل ریسٹورنٹ خیبرا جنسی میں اسلحے کی دکانوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ عورتیں بالکل نظر نہیں آتیں، صرف چادریں لپیٹے پٹھان اور افغانی ہیں اور ہر ایک اسلحے سے لیس ہے۔ لگتا ہے ابھی گولی چلنے کو ہے۔ خیبر ایجنسی میں خاص طور پر چار قبائل ہیں۔ سلیمان زئی، آفریدی، ملاگوری اور خٹک ٹرائیب۔

مٹی کے بڑے بڑے احاطے ہیں، جن کی اونچی اونچی دیواریں ہیں اور بلند و بالا دروازے ہیں۔ ان کو بھٹیاں کہتے ہیں۔ یہ تعداد میں ان گنت ہیں جو سڑک کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ہر شخص رائفل اٹھائے ہے جیسے یہ ان کا انتخابی نشان ہو۔ کچھ دور پر ہری سنگھ کا جمرود فورٹ ہے۔ دائیں طرف مقامی لوگوں کا قبرستان ہے۔ یہ مقامی لوگوں کا قبرستان کیوں کہلاتا ہے۔۔۔؟ معلوم نہیں۔۔۔ ہوسکتا ہے ہم جیسے باہر کے لوگوں کو مار کر کسی اور جگہ دفناتے ہوں۔ بہر حال رائفل زندگی اور موت ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ایک بہت اچھی بات ہے کہ ہر جگہ سکول امدرسوں اور کالج کے سائین بورڈ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ چٹیل پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو چلتا چلا جاتا ہے۔ ایک ویرانی ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ اس دشت کو دیکھ کر مجھے اپنا گھر قطعاً یاد نہیں آیا۔ کیپٹین کاشف شعیب کے سوالوں میں گرفتار ہے۔ یہ کونسا جہاز ہے؟ پشتو آتی ہے؟ پشتو کا امتحان تو دیا ہوگا؟ پشتو الاؤنس ملتا ہے؟ پھر تو پشتو بہت اچھی طرح آنی چاہئے۔ پریڈیٹر دیکھا ہے؟ جی! پریڈیٹر، امریکی جہاز جو بغیر کسی پائلٹ کے ہوتا ہے۔ یہ جہاز جیکب آباد سے اڑتا ہے اور کیمرے سے تصویریں لے کر سیٹلائٹ کے ذریعے امریکا بھیجتا ہے۔ اس کے ذریعے امریکن بارڈر پر نظر رکھتے ہیں۔ سر؛ کیپٹین کاشف امپریسڈ تھا۔ شادی ہوئی ہے؟ جی سر۔ کتنے بچے ہیں؟ ایک۔



خیبر رائفلز آفیسرز میس



آئی ایم انڈر اریسٹ



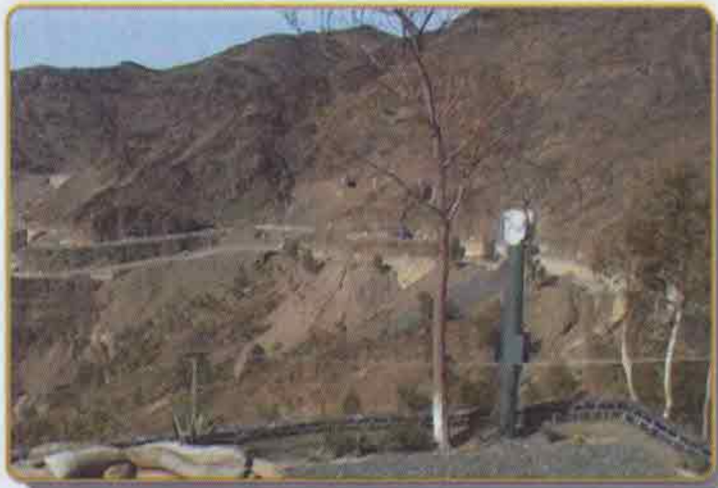
خیبر رائفلز بینڈ



خیبر رائفلز آفیسر میس



اینٹی ایئر کرافٹ گن مچینی پوسٹ



روسی راکٹ مچینی پوسٹ







سینڈ ماڈل



تیمور لنگ کی نشانی

اپنے والد سے کتنے پیسے لیتے ہو؟ نہیں لیتا سر۔

دائیں ہاتھ پر ٹرین کی پٹڑی ہے۔ کبھی اس پر سفاری ٹرین چلتی تھی۔ کبھی۔۔۔۔ کسی زمانے میں جب یہ جگہ امن کا گہوارہ تھا تو یہاں ٹرین چلتی تھی اب یہ پٹڑی ویران پڑی ہے۔ اس لائن پر بانوے برج اور چھتیس سرنگیں ہیں۔ ریلوے لائن اس جگہ کی ویرانی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

گاڑی علی مسجد پر پہنچ جاتی ہے، جہاں شگئی فورٹ ہے۔ یہ خیبر پاس کا داخلی دروازہ ہے۔ یہاں پر راستہ ذرا تنگ ہے۔ سنا ہے بعض جگہ یہاں راستہ اتنا تنگ تھا کہ صرف ایک اونٹ گزر سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہاں سے نہ جانے کتنے لشکر اور کتنی اقوام گزریں۔ وہاں لگے ہوئے ایک پتھر کے مطابق۔

۱۔آریا ۱۶۰۰ابی سی

۲۔یونانی ۳۰۵۔۳۲۷

۳۔ چنگیز خان اور خاندان ۱۲۲۰۔۱۳۶۹

۴۔تیموریہ ۱۳۸۰۔۱۵۰۱

۵۔مغلیہ ۱۵۲۶ ۱۷۳۹

۶۔بابر ۱۵۰۷۔کو گزرا

۷۔درانی ۱۷۴۷۔۱۸۱۸

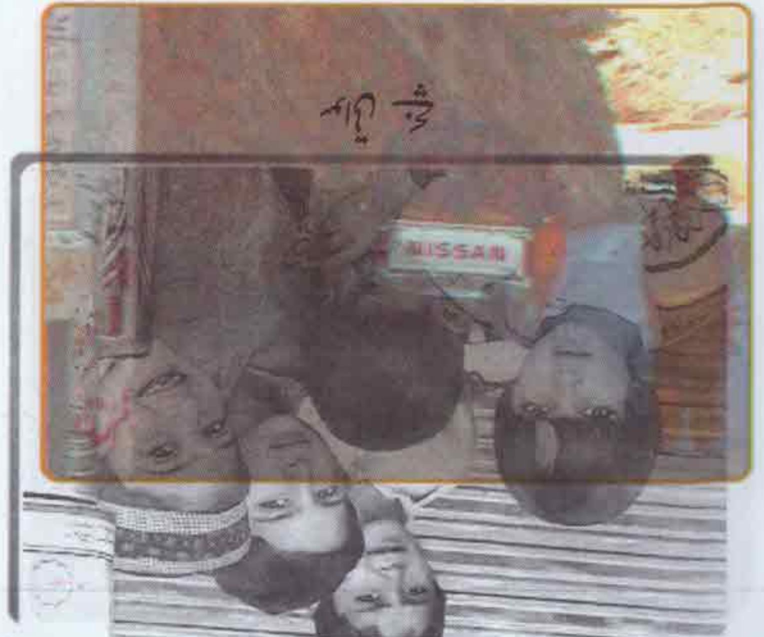
۸۔سکھ ۱۸۲۵۔۱۸۴۰

۹۔برطانوی راج ۱۸۲۶۔۱۹۴۷

۱۰۔اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۴۷۔

دوسری طرف پہاڑوں کے دامن میں کچھ کچے مکان ہیں، کچھ اور آگے حاجی ایوب خان کا قلعہ ہے جو ایک سمگلر کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لئے نہ جانے کس پاس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے سامنے سے گزرتی ہوئی ویران ریلوے لائن ہے، جو اس صراط مستقیم کی یاد دلاتی ہے جو آج کل خالی پڑی ہے۔ راستے میں بدھ کا سٹوپا ہے جو کسی مسجد کی طرح بھلائی کے راستے کی طرف بلاتا ہے۔ سامنے سے گزرتی ہوئی برینڈ نیو کار جس میں بیٹھی شٹل کاک برقعے میں ملبوس دو





خواتین۔ ایک مٹی کے گھر کی چھت پر پڑا نیلا پلاسٹک کہ مکینوں کو بارش کے پانی سے بچا سکے۔ غرض وقت اور زندگی کے تضادات اور حوادث ہیں کہ ہر طرف بکھرے پڑے ہیں اور بڑے سے بڑا شہنشاہ ان کے سامنے مجبور ہے کہ تاریخ تو بہر حال رقم ہوتی ہی رہے گی۔

اور پھر تھوڑا سا آگے آج کے موڈرن انسانی ہمدردی کے پرچار کرنے والوں کا بہت بڑا ماڈل طورخم کا بارڈر افغانستان۔ نیلے برقعوں کے جھنڈ، پریشان شکلیں، وہ آج بھی پناہ کے لئے پڑوسی ملک کے دروازے پر بھیک کے منتظر ہیں۔ ٹی وی پر دیکھنے اور اصل میں دیکھنے میں بہت فرق ہے، یہاں میں چینل نہیں بدل سکتی، مجھے ہر حال میں دیکھنا ہے، میرا کیمرہ بھی میرے ساتھ ہے کہ ہر منظر کو محفوظ کر لوں، مگر میرے ہاتھ اس منظر کو محفوظ کرنے کے لئے نہیں اٹھتے۔ ایک شخص اپنی بیمار ماں یا شاید بیوی کو ایک ٹرالی پر لے کر جا رہا ہے۔ جامنی برقعے میں ملبوس عورت، یہ عورت جسے حالات نے کبڑا بنا دیا ہے۔ بچے زار و قطار روتے ہیں اور اس عورت کو نوچتے ہیں۔ اگرچہ اب یہ واقعہ ٹی وی سکرین کے لئے پرانا ہو چکا ہے مگر اس میں میرے لئے ابھی بھی پوری زندگی ہے۔ میں ان تینوں فوجیوں کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرتی ہوں حالانکہ ان آنسوؤں پر شرمانا کیسا؟ اگر اتنا بڑا ملک اپنے کئے پر شرمندہ نہیں ہے اور ابھی بھی دنیا کا سب سے بڑا دردمند ہونے کا دعوی کرتا ہے، تو مجھے بھی کچھ تو کرنے کا حق ہے چاہے وہ بے بسی کے آنسو ہی کیوں نہ ہوں۔ جہاں سے میں یہ منظر دیکھتی ہوں وہیں سے مجھے تیمور لین بھی نظر آتی ہے۔ گائیڈ کے کہنے کے مطابق وہ پہاڑی جس پر ایک سرنگ نما سلائیڈ ہے جس میں انسان کو ایک طرف سے ڈالا جاتا تھا اور دوسری طرف وہ قتلوں کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔ تیمور کی قتل گاہ کہ یہی اس کے دل بہلانے کا طریقہ ہوگا۔ وہ بلیڈ جو لوگوں کے ٹکڑے کرتے تھے آج کل لندن میوزیم کی زینت ہیں۔ لگتا ہے تمام دنیا کی ظلم کی داستانیں یہیں بکھری پڑی ہیں۔ دوسری طرف امریکا کو بھی پوری دنیا چھوڑ کر یہی جگہ ملی تھی کہ پورے افغانستان کو ایک قبرستان میں تبدیل کر دیا، اور اصل مجرم ابھی تک لاپتہ ہے۔ باہر تپتی ہوئی دھوپ ہے، بلکتے ہوئے بچے ہیں اور انسانیت کے نام پر رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑے ہیں۔ سامنے بیٹھے فوجی کی آنکھیں اور زبان اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے حال اس سے بھی خراب تھا جب بچے زخمی تھے اور ان کا تڑپنا دیکھا نہ جاتا تھا۔ فوجی

افسر کی آنکھوں میں گلہ ہے جیسے کہہ رہا ہو کیا تم سمجھتی ہو تمہارے ہی سینے میں دل ہے کیا مجھ پر کچھ نہیں گزرتی کہ میں دن رات یہاں بے بس لوگوں کو دیکھتا ہوں، اور پھر مجھ پر ظالم ہونے کا الزام بھی ہے۔ اس افسر کے چہرے کی لکیریں اس کے حساس ہونے کی گواہ تھیں۔

وہاں سے ہمارا قافلہ ایک نزدیکی پوسٹ مچنی پر رکا جہاں ایک افسر نے ایک مٹی سے بنے ماڈل اور حقیقی پہاڑیوں کے ذریعے ہمیں یہاں کے جغرافیے اور تاریخ کو سمجھنے میں مدد کی۔ مچنی بارڈر اونچائی پر واقع ہے جہاں سے آپ دور تک دیکھ سکتے ہیں۔ افغان جنگ میں روسیوں کا پھینکا ہوا راکٹ وہاں موجود تھا۔ وہاں پر ایک مشین گن سامنے موجود تھی۔ اس کے علاوہ وہاں سے دوسری پوسٹس بھی دیکھی جا سکتی ہیں، جہاں سے حملے کی صورت میں وہ ایک دوسرے سے رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ پاک افغان بارڈر لائن ایک انگریز ڈیورینڈ نے بنائی تھی۔ مچنی پوسٹ سے آپ ایک بیحد خوب صورت منظر کا نظارہ کرتے ہیں جہاں سے آپ پہاڑوں میں بل کھاتی سڑکوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ افغانستان کے بارڈر کو دیکھ سکتے ہیں، تیمور کی جیل دیکھ سکتے ہیں، ایسی زمین دیکھ سکتے ہیں جہاں پانی کی کمی ہے اور اس کے باوجود منظر کی خوب صورتی میں کوئی کمی نہیں ہے۔

شام چار بجے ہم بے حد تھک چکے تھے، جی چاہتا تھا کسی جگہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔ دعا قبول ہوئی اور ہم خیبر رائفلز کے میس میں پہنچ گئے۔ یہ میس ایک صدی سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ میس کے داخلی ہال میں ہر طرف شیلڈز تھیں۔ ان گنت کمانڈرز کی تصاویر تھیں۔ قائداعظم کی تصویر تھی، ہال میں ایک گروپ لوک دھنیں بجا رہا تھا، جو اس جنگل میں رونق کا باعث تھیں۔ ہم نے اس خوبصورت ماحول میں کھانا کھایا اور پھر باہر باغ کی سیر کی جہاں پر ایک سوونیر شاپ تھی۔ مور تھے اور ایک پنجرے میں پرندے تھے۔ پنجرے پر ایک بڑا سا نوٹ تھا جس پر لکھا تھا ''آئی ایم انڈر اریسٹ۔'' کچھ انگریز افسر اس رات کچھ زیادہ پی گئے تھے انہیں ایک پرندہ نظر آیا جو اڑ نہیں پا رہا تھا، انہوں نے اس کو اس پنجرے میں بند کر دیا۔ اس دن سے اس پنجرے پر لکھا ہے'' آئی ایم انڈر اریسٹ۔''

اور آج بیس مارچ کی صبح ہے۔ ٹی وی پر دکھایا جا رہا ہے کہ عراقیوں پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔ آج کا سورج جب وہاں طلوع ہوگا تو منظر بدل چکا ہوگا، بقول بش! اے نیو ایرا ہیز بیگن۔ ایک نیا دور شروع

ہو چکا ہے۔ دور تو وہی پرانا ہے انسان اتنا ہی ظالم ہے صرف ظلم کرنے کے انداز بدل چکے ہیں۔ پہلے باری باری انسان کے ٹکڑے کئے جاتے تھے اب ایک وقت میں بہت سے انسانوں کی دھجیاں اڑائی جا سکتی ہیں۔ ۔ زمانے کے انداز بدلے گئے۔

دوسری طرف میں اس وقت وادیِ سوات میں دریائے سوات کے کنارے ایک چھوٹے سے ایوب ہوٹل میں ایک عارضی چھپر کے سائے میں ان چھوٹی چھوٹی بطخوں کو دیکھتی ہوں جو خراماں خراماں اٹھکھیلیوں میں مصروف ہیں۔ میرے بائیں طرف ایک پندرہ سالہ لڑکا ظہر کی نماز ادا کر رہا ہے۔ سیب کے درختوں پر شگوفے ہیں، اور لوگ ان کے خواب ناک سائے میں سڑک کے کنارے چائے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ سامنے سے ایک مچھیرا ایک عجیب سی کشتی میں کنارے پر اترتا ہے۔ یہ کشتی دو چمڑے کی مشکوں کی شکل میں بنائی گئی ہے۔ ہاتھوں میں مچھلی کا تھیلا لئے وہ ہوٹل کی طرف بڑھتا ہے اور میں کہ بذاتِ خود ایک سیلانی نہیں ہوں مگر کیونکہ برسوں پہلے ایک سیلانی کے ساتھ زندگی گذارنے کا وعدہ کیا تھا تو اپنے اُس برسوں پہلے کئے گئے وعدے کی پابند ہوں اور ان ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر مالاکنڈ سے مردان تک کا سفر طے کرنے کے بعد اس مچھیرے کو دلچسپی سے دیکھتی ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے پینتیس سال پہلے جب ہم ان سڑکوں سے گزر رہے تھے تو یہ سڑکیں کہیں بہتر تھیں۔ واقعی ہنی مون منانے کے لئے میں نے کتنی خوب صورت جگہ کا انتخاب کیا تھا، اگرچہ اس وقت ان خوبصورت مناظر کا ہنی مون سے یا خوشی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں سوچتی ہوں کہ لوگ ہنی مون کے لئے حسین جگہوں کا انتخاب کر کے ان جگہوں کو ہنی مون پر کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ہنی مون کا نشہ تو خود ایک ایسا نشہ ہوتا ہے کہ تمام مناظر پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ آپ ایک دوسرے کے سحر میں کچھ اس طرح گرفتار ہوتے ہیں کہ ہر چیز سے غافل ہو جاتے ہیں یا پھر ممکن ہے ان مناظر کی ملاوٹ سے نشہ دو آتشہ ہو جاتا ہو۔ دور دھوپ میں بالکل پانی کے ساتھ دو کرسیاں ڈالے غالباً کوئی ہنی مون کپل بیٹھا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، شاید بہتے ہوئے پانی کی موسیقیت سے بھی بے خبر، پانی کی وہ آواز جو مجھ پر سحر طاری کرتی ہے۔ شاید بیتے ہوئے سال انسان کو زیادہ حساس بنا دیتے ہیں اور وہ قدرت کی ہر چیز سے زیادہ محظوظ ہو سکتا ہے۔۔۔۔ مارچ کا مہینہ ہے، درختوں سے نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور بہار اپنی آمد کا پتہ دیتی ہے۔ سائے میں بیٹھو تو



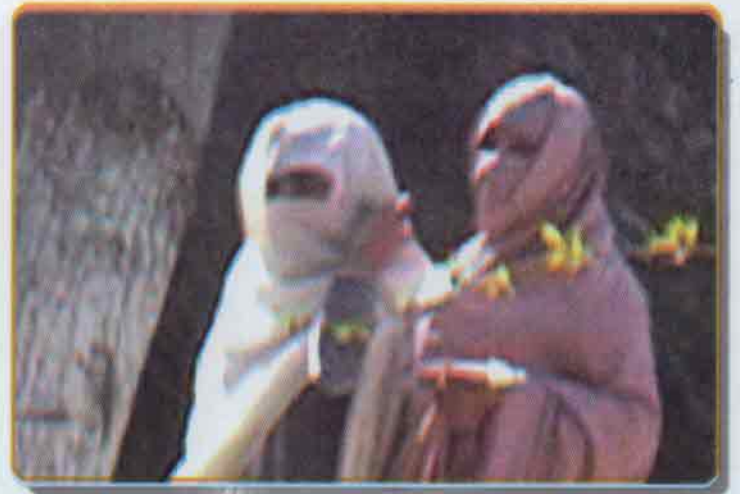
بطخیں سوات



مچھیرے سوات



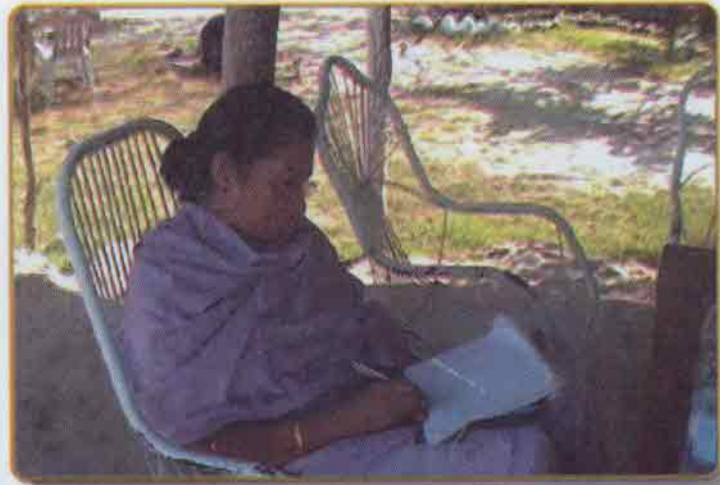
ٹرالی سوات



سواتی خواتین



مدیاں ہوٹل سوات



ایوب ہوٹل سوات



پانی سوات



مسجد کا دروازہ بحرین



سواتی بچے



سرینا ہوٹل سوات



منگورہ سوات



سبوحہ اور گائیڈ عمر بحرین



مسجد کی چھت بحرین



کرکٹ منگورہ



مدیاں کا پل



کالام کا راستہ



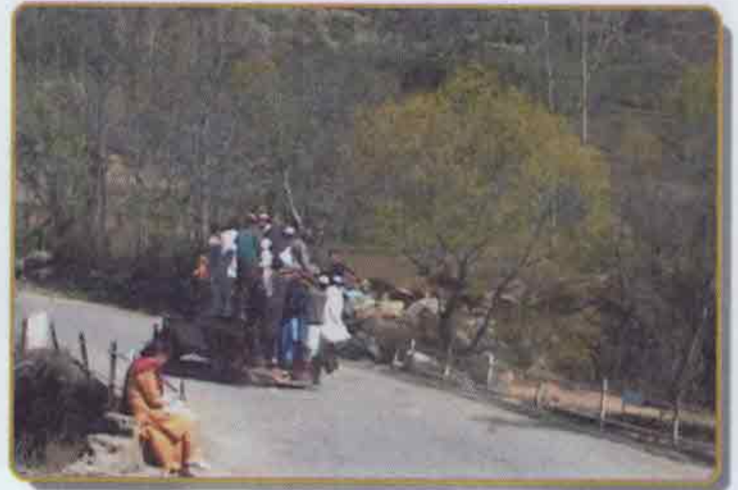
پانی سوات



پانی سوات



بحرین سوات



فلی لوڈڈ سوات



سوات



مالاکنڈ اور سیدو کے درمیان واحد بیت الخلاء



مچھیرا سوات



سیب کا باغ سوات



شعیب سوات



سواتی بچے



مٹراورسرسوں کے کھیت سوات



نیاہوٹل منگورہ

سردی ہے دھوپ میں گرمی محسوس ہوتی ہے۔

تازی فرائیڈ مچھلی کی خوشبو اشتہا بڑھاتی ہے۔ غالباً بطخوں کو بھی یہ خوشبو آ گئی ہے اور تین چار بطخیں ہماری میز کے نیچے منتظر ہیں کہ ہم ان کی بھی میزبانی کریں اور وہ بھی مسالے والی مچھلی سے لطف اندوز ہوں۔ لگتا ہے سارے محلے کو خبر ہوگئی ہے۔ پانچ اور بطخیں مٹکتی ہوئی مچھلی کا مطالبہ کرنے لگیں بلکہ کراچی کے بھتہ لینے والوں کی طرح غرانے لگیں۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق بھتے والوں سے ڈر کر زیادہ تیزی سے ان پر مچھلی نچھاور کرنی شروع کردی۔

پانی کے کناروں پر پڑے ہوئے چکنے پتھر، پس منظر میں پوپلر کے سوکھے ہوئے درخت جو سخت سردی گزارنے کے بعد ابھی تک نئی کونپلوں کے پھوٹنے کے منتظر ہیں۔ ہر طرف پلاسٹک کی نیلی پیلی رنگ کی بکھری ہوئی کرسیاں اور سوات کا خوش آمدید کا بورڈ۔ لگتا ہے کراچی کی تمام تھکن دور ہوگئی ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ ڈسپرین کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے جو جسم اور روح کو آرام دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں ذرا سا اوپر سیبوں کے پیڑوں کے جھنڈ ہیں جو سفید شگوفوں کے نشے میں سرشار ہیں، گہرے گلابی رنگ کے آڑو کے درخت جو پہاڑوں کے دامن میں آگ لگاتے ہیں اور پھر خوبانی کے ہلکے گلابی شگوفے جو سیب کے درختوں سے کچھ لمبے ہیں اور فخر سے یوں سر اٹھائے کھڑے ہیں جیسے فلک کو چھونے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ابھی ان درختوں پر پھلوں کا بوجھ نہیں پڑا، اس لئے بچوں کی طرح زندگی کا مزہ لیتے ہیں۔ سامنے سے ایک پانچ سالہ بچہ، بیس پچیس بھیڑوں کو ہنکانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بھیڑوں کو بھی معلوم ہے کہ وہ بچہ ہے اس لئے اس سے اٹھکھیلیاں کرتی ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف قد آور خشک درخت حسرت سے شگوفوں اور غنچوں کو دیکھتے ہیں اور خاموشی سے بہار کا انتظار کرتے ہیں کہ وہ گرمی میں اس سڑک پر سائبان کی طرح جھکے ہوئے ہوں گے۔

پھلوں کے درخت کبھی نزدیک آجاتے تھے اور کبھی ہرے بھرے کھیتوں کے پار چلے جاتے تھے اسی آنکھ مچولی سے ہوتے ہوئے ہم سیدو شریف میں داخل ہوئے۔ میں نے بالکل نہیں سوچا تھا کہ سیدو شریف میں اتنی آبادی اور اتنا ٹریفک ہوگا۔ ارادہ تو مدین جا کر رکنے کا تھا مگر میری وجہ سے سوات ہوٹل یا سرینا ہوٹل کی تلاش شروع ہوگئی کہ کھوکھا نما ہوٹلوں میں خواتین کی ضرورتوں کا کوئی خیال نہیں رکھا

جاتا۔ شاید خواتین کا ان کی زندگی میں وجود ہی نہیں ہے، اور اگر وجود ہے تو اس حد تک کہ یہ علاقہ عورتوں کی ناک کاٹنے کے لئے مشہور ہے۔ ہمارے یہاں تو یہ جملہ محاورتاً استعمال کیا جاتا ہے مگر ان کے یہاں عملی طور پر ناک کاٹی جاتی ہے۔ ہم نے کئی جگہ بازار میں گاڑی روکی اور لوگوں سے سرینا کا راستہ دریافت کیا مگر کوئی میری بات کا جواب نہیں دیتا۔ شاید میں اس قابل نہیں ہوں کہ میری بات کا جواب دیا جائے۔ آخرکار اسکول کے دو لڑکوں نے اشارے سے بتایا کہ دائیں طرف مڑنے پر ہمیں سرینا کا بورڈ نظر آئے گا۔

سنا ہے سوات میں لڑکیاں بیچی جاتی ہیں۔ میں مطمئن تھی کہ شعیب کے پاس کیش نہیں صرف ویزا کارڈ تھا اور یہاں سٹی بنک کے کارڈ پر لڑکیاں نہیں خریدی جاسکتیں۔ ورنہ عالم تو اب کچھ اس لطیفے کا سا ہے کہ ایک آدم خور قبیلے کا ایک باپ اور بیٹا جنگل میں جارہے تھے کہ ایک خوبصورت لڑکی نظر آئی۔ بیٹے نے کہا چلیں ابو اسے گھر لے جاتے ہیں اور پکا کر کھاتے ہیں۔ ابو نے کہا ہاں بیٹا چلو اسے گھر لے جاتے ہیں اور تمہاری امی کو پکا کر کھاتے ہیں۔

سرینا ہوٹل کی مضبوط عمارت، برآمدے کے گول ستون اور صاف ستھرے باغیچوں نے سفر کی تمام تھکن دور کردی۔ برآمدے میں کین کا فرنیچر ہے۔ ہم نے برآمدے میں آتی ہوئی دھوپ میں بیٹھ کر چائے اور سینڈوچز کا آرڈر دیا۔ ہمارا ویٹر ہنزہ کا رہنے والا تھا اور اس کے چہرے کی معصومیت سے عیاں تھا کہ اس کو شہروں کی ہوا نہیں لگی۔ سرینا ہوٹل کے دو سو سے زیادہ کمروں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ہمارا ٹورزم ابھی زندہ ہے۔ لان کے چاروں طرف گلاب کے ان گنت پودے ہیں۔ لگتا ہے کہ اپریل کا مہینہ اس باغیچے کو گل و گلزار کردے گا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہی ہوٹل پہلے سوات ہوٹل تھا، جہاں ہم پینتیس سال پہلے ٹھہرے تھے۔ ؎ میں تو وہ نہیں رہا ہاں مگر وہی ہے تو۔

ہم نے جاکر وہ کمرہ بھی دیکھا جہاں ہم چند دن ٹھہرے تھے۔ ایسا لگا کہ وہاں کی زمین ہمیں دیکھ کر کہہ رہی ہو کہ تمہیں کیا ہوگیا! میں کہ وقت کی لکیروں کے ساتھ زیادہ خوبصورت ہوگیا ہوں۔ اور ایک تم کہ وقت کی تہوں نے تمہیں گرد کے نیچے دبا دیا ہے۔ ہم نے اگلے دن کے لئے یہاں کمرہ بک کروایا اور خود مدین کی راہ لی۔ سوات سے آگے کا راستہ بھی اتنا ہی دل فریب تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ

سیدھے ہاتھ پر سنگلاخ پہاڑ تھے۔ بائیں طرف دور تک پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیت، اس سے آگے پھلوں کے شگوفے اور پھر حد نظر تک بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ جو آسمان سے جاکر ملتا تھا بلکہ آسمان ان سے جھک کر ملتا تھا۔ دُور پہاڑوں پر چاندی سی برف کسی دلہن کی مانگ میں افشاں کی یاد دلاتی تھی۔ اور پھر اسی سڑک کے کنارے وقت کے ہاتھوں تھکا ہوا مچھلی بیچتا ہوا سواتی بوڑھا۔ مدین جاتے ہوئے کئی چھوٹے چھوٹے بازار آئے، ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے لگتا تھا کہ جیسے ہم کراچی کے جوڑیاں بازار پہنچ گئے ہوں۔

دن ڈھل کر سب منظر کو چھپانے والا تھا۔ بائیں طرف سورج بادشاہ دن کے آخری منظر پر کچھ اس طرح لائٹ افیکٹ دیتا تھا کہ پہاڑ پس منظر میں بالکل کالے نظر آتے تھے۔ فرنٹ سٹیج، گھاس اور سرسوں کے پھولوں سے سبز اور زرد تھا، سیب اور آڑو کے درخت اداکاروں کی طرح تھے اور دن کے آخری منظر میں زیادہ محنت سے اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ مٹر کے کھیت بھی اس سین میں کہیں کہیں سپورٹنگ کردار ادا کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب سورج غروب ہوگیا تو جو پہاڑ پس منظر میں تھے وہ نمایاں ہوگئے، ان پہاڑوں میں جگہ جگہ سیب اور آڑو کے شگوفوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی نے ان پہاڑوں میں گلدستے سجا دئے ہوں۔ ایسے مسحور کن مناظر کبھی کبھی ہی دیکھنے کو ملتے ہیں، خاص طور پر ہم جیسے لوگوں کو، جنہیں شہری زندگی کے شب و روز نے اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اور بھی خوشیاں ہیں جو ہماری زندگی کا حصہ ہونا چاہئیں۔ سیدو شریف اور مدین کے درمیان جب سورج غروب ہوگیا تو ایک ایسا مقام بھی آیا کہ سانس روکنے کو جی چاہا۔ ہر مقام کی خوبصورتی وقت کے لحاظ سے بھی ہوتی ہے، ایک سحر تھا کہ ہر طرف بکھر گیا تھا، شاید تپتی دوپہر میں جب سورج کی تمازت سے ہر چیز بے انتہا روشن ہوتی ہے اس وقت یہ منظر اتنا دلفریب نہ ہو جتنا اس وقت تھا۔ شاید ایسے ہی کسی موقع کے لئے کہا گیا ہے کہ، ؎ کیا جانئے تو نے اسے کس حال میں دیکھا۔

ہم ایک چھوٹے سے پل سے گزرتے ہیں تو سامنے مدین ہوٹل کا بڑا سا بورڈ نظر آتا ہے۔ گاڑی اس طرف مڑ جاتی ہے کہ یہ بھی ہماری پرانی یادوں کا حصہ ہے۔ اس ہوٹل میں بھی کچھ تبدیلیاں آچکی ہیں مگر اتنی نہیں جتنی سوات ہوٹل میں آئی ہیں۔ صرف کمروں کی تعداد بڑھ گئی ہے مگر ہاں ایک تبدیلی

بہت بڑی ہے کہ اس وقت یہاں بجلی نہیں تھی۔ کمرے میں بیرے نے ایک لالٹین جلائی تھی، آج یہ جگہ بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ آج رات اس ہوٹل کے واحد مہمان ہم ہی ہیں۔ فضا میں خنکی کافی زیادہ ہے ہم نے اپنے سویٹرز نکال لئے ہیں۔ ہر طرف صرف پانی کے بہنے کی آواز ہے۔ ہم نے تھوڑی دیر چہل قدمی کی۔ بیٹھنے کے کمرے میں چائے اور بسکٹ کھائے۔ یہاں کے خانساماں کو چکن کڑھائی بنانے کا آرڈر دیا۔ لگتا تھا جیسے اپنا ہی گھر ہے۔ چوکیدار کا رویہ بہت ہی اپنائیت لئے تھا۔ لگتا ہے کے یہاں کا سٹاف بھی اکیلے رہ رہ کر تھک چکا تھا۔ اس لئے ہمیں بڑی گرم جوشی اور مکمل توجہ سے خوش آمدید کہتا تھا۔ بستر میں پہنچے تو بستر اتنا ٹھنڈا تھا کہ لگا ٹھنڈے اور گیلے بستر پر لیٹ گئے ہوں۔ رات کو جب بھی آنکھ کھلی پانی کی آواز بڑی خوفناک محسوس ہوئی۔ ٹی وی موجود تھا مگر صرف چائینیز سٹیشنز پکڑتا تھا۔ اگلی صبح تازہ دم ہو کر ہم نے نان انڈے اور رات کی بچی ہوئی مرغی کا ناشتہ کیا اور پھر اگلی منزل کی راہ لی۔

دریائے سوات دائیں طرف میرے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ ایک مسلسل موسیقی ہے جو کانوں کو بھاتی ہے۔ ہر طرف ہلکی دھوپ ہے۔ مدین سے بحرین بارہ میل پر واقع ہے۔ بحرین میں ہماری ملاقات ایک چرب زبان گائیڈ عمر سے ہوئی، اس گائیڈ کی زبان کی تیز رفتاری کو سن کر مجھے بارہ سال پہلے کا ایک ترک گائیڈ یاد آ گیا۔ اس زمانے میں میرا چھوٹا بیٹا ناصر بوہازیچی یونیورسٹی استنبول میں پڑھتا تھا۔ ہم اسے ملنے گئے تو اسی بہانے ہم نے استنبول کی سیر بھی کر لی۔ اس شام ہمارے گائیڈ نے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ ترک قوم سے بڑھ کر کوئی قوم نہیں۔ اس نے کہا کہ تمہارا تاج محل ہمارے اس آرکیٹیکٹ نے ڈیزائن کیا تھا جس نے ہماری بلیو موسک (مسجد) بنائی ہے؛۔ اس کے خیال سے دنیا کی ہر چیز ترکوں نے ایجاد کی تھی۔ یہاں تک کہ میکڈونلڈ کو دیکھ کر بڑے طنز سے بولا کہ یہ۔۔۔امریکن سمجھتے ہیں کہ یہ انہوں نے ایجاد کیا ہے؟ یہ تو دراصل ترکی کوفتہ ہے جو ہم صدیوں سے کھا رہے ہیں۔ بحرین کا گائیڈ محمد عمر بھی جس نے ہمیں اندرون شہر کی سیر کروائی کچھ ایسا ہی شخص تھا۔ اسے اپنے بحرین پر بہت فخر تھا۔ بحرین واقعی ایک خوبصورت جگہ تھی۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اندر اتنی گلیاں، اتنی سیڑھیاں اتنی دکانیں، اتنے گھر اور بازار ہوں گے۔ اندر ایک خوب صورت و کشادہ مسجد نقشبندیہ تھی، جس کا دروازہ ابھی زیر تعمیر تھا۔ اگر کوئی شخص اس شہر سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے تو

ضروری ہے کہ وہ یہاں پر زمین کا ایک ٹکڑا خریدے۔ کسی ایسے ہی شخص نے یہ زمین خریدی تھی اور پھر یہاں کے کسی شخص نے اس پر مسجد تعمیر کی۔ جتنی لکڑی اس مسجد میں استعمال ہوئی ہے وہ بالکل مفت ہے، البتہ کاریگروں کو ان کا محنتانہ دیا گیا ہے۔ اس کو بنانے والے ہاتھ یہاں کے ان نوجوانوں کے ہیں جنہوں نے سعودی عرب میں یہ کام کیا ہے۔ ان کے پاس وہ تمام مشینیں ہیں جس سے لکڑی کے ٹکڑوں کو جوڑنے کے بعد درمیان میں بالکل ہموار کر دیا گیا ہے۔ پوری چھت پر خوبصورت کارونگ ہے، آئینے کی محرابیں ہیں اور پھر ان پر لکڑی کی جالی کا کام ہے۔ غرض اس قدیم جگہ پر یہ مسجد حیران کرنے کے لئے کافی ہے۔ اندر کے ہال پر قالین ہے چھت پر پنکھے ہیں۔ بائیں کھڑکیوں کے نیچے دریائے کابل بہتا ہے، جگہ جگہ پانی کی آبشاریں ہیں جو مسجد کی شان کو مزید دوبالا کرتی ہیں، وہیں سے شہد کی چھتیں بھی نظر آتی ہیں جہاں سے خالص شہد نکالا جاتا ہے۔ کہیں دودھ کی نہریں بھی ہوتیں تو بالکل جنت کا منظر تھا۔ مسجد میں گرم اور ٹھنڈے پانی کا بندوبست ہے۔ یہ گیزر لکڑی سے گرم کئے جاتے ہیں۔ سنا ہے اس مقام پر جو پانی گرتا ہے اس سے بجلی نکالی جائے گی اور ڈیڑھ سال کے اندر یہ لوگ بجلی کے سلسلے میں خود کفیل ہو جائیں گے۔ مسجد سے نکل کر ہم نے بقیہ جگہ کی سیر کی۔ سامنے ایک راستہ ہے جہاں چینی اور جاپانی ٹورسٹ کو اوپر پہاڑ کی چوٹی تک لے کر جاتے ہیں، مگر عمر نے مجھے پہلے ہی بتا دیا کہ ''امی! ہم عورتوں کو ادھر نہیں لے جاتے''، گویا میرا راستہ تو بند ہو گیا۔ ایک سسپن شن برج سے ہو کر ہم بستی کے پار پہنچے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں بڑے شوق سے ہمیں دیکھتی تھیں اور پھر کیمرے کو دیکھ کر اپنا منہ چھپاتی تھیں۔ مسجد سے اگلی گلی میں ایک کمرے میں لڑکوں کا اِن ڈور کلب تھا جس میں اس وقت کچھ لڑکے لوڈو، کیرم بورڈ اور شطرنج کھیل رہے تھے۔ ساتھ ہی چائے والے کی دکان تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اس محلے کی سیڑھیاں پکی نہیں تھیں۔ ابھی چند مہینے پہلے ورلڈ بینک نے یہ سیڑھیاں پکی کی ہیں۔ مین روڈ پر چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جن میں انواع و اقسام کی چیزیں تھیں۔ جن میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ یہاں کی لوکل جیولری اور ہینڈی کرافٹ بھی شامل تھے۔ پل کے اوپر کی طرف سیب کے باغ تھے جہاں بقول گائیڈ عمر کے فلموں کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے ہم ان مناظر کو دیکھ کر سمجھتے ہوں کے یہ پاکستان سے باہر کے سین ہیں۔ انہیں پہاڑوں میں آٹے کی پن چکیاں تھیں، جن سے نکلنے والے آٹے کی مہک انسان کو جنت

سے نکلوانے کی وجہ سمجھاتی تھی۔ جن پتھروں پر میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی تھی عمر گائیڈ ان پر سے ایسی تیزی سے گزرتا تھا کہ میں اس کے سامنے شرمندہ تھی۔ پیچھے مڑ کر مجھے دیکھ کر بولا؛ "ہمیں معلوم ہے آپ شہر والوں کو ان پتھروں پر یقین نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہوتا امی کچھ نہیں ہوتا۔ اس باریش سفید داڑھی والے گائیڈ کے بار بار امی کہنے پر میں خود کو سمجھاتی تھی کہ یہ محض عزت و احترام کی خاطر مجھے امی کہتا ہے ورنہ۔۔۔۔۔۔ مگر وہ شاید میرے رنگے ہوئے بالوں کی اصلیت سے واقف تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ابھی اسی سردی میں ایک نو بیاہتا جوڑا کالام تک گیا جہاں برف کی وجہ سے سڑک بند ہوگئی۔ کسی لوکل نے ان کی مدد کی اور چھتیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے وہ نیچے تک پہنچے۔ کراچی کا یہ جوڑا ان صعوبتوں کا کہاں عادی تھا۔ گائیڈ نے ان سے پانچ ہزار اپنا محنتانہ وصول کیا۔ پیروں فقیروں کا زور اس حصے میں بھی بہت زیادہ ہے۔ ہر دوسرا شخص دم درود کراتا ہوا نظر آتا ہے۔

بحرین سے کالام کا فاصلہ محض تیس کلومیٹر ہے مگر سڑک اتنی خراب تھی کہ ہم دس میل بعد ہی واپس مڑ گئے۔ نہ فلک سیر ہوٹل دیکھا نہ فلک سیر کی سفید انڈے جیسی چوٹی دیکھ سکے۔ راستہ خوبصورت بھی ہے مگر ساتھ ہی دونوں طرف کھڑے ہوئے کالے پہاڑ اور بہت نیچے بہتا ہوا دریا ایک ہیبت پیدا کرتا ہے۔ اپنی گاڑی کی جگہ جیپ پر جانا زیادہ بہتر رہتا یا پھر پیدل چلتے چلے جاتے۔ دریائے کابل کے پار ایک ریسٹورنٹ نظر آیا۔ ہم نے گاڑی کھڑی کی اور ایک چھوٹے سے پل پر سے ہوتے ہوئے چائے کی تلاش میں وہاں پہنچے۔ فوڈ کرافٹ ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ بند تھا۔ ابھی تک ٹورسٹ سیزن شروع نہیں ہوا تھا اس لئے ہمیں اکثر چائے خانے بند ہی ملے۔ واپسی کے سفر میں ہم تھوڑا آگے جا کر ایک جگہ رکے جہاں ایک دکان والے نے پہلے پیپسی اور پھر چائے سے ہماری تواضع کی۔

دن کا ایک بجا ہے ہم مدین سے سیدو شریف جاتے ہوئے ایک جگہ رکے ہیں، جہاں گریس ہوٹل کا بورڈ لگا ہے۔ بائیں طرف بہت سی جگہوں سے آبشار کی صورت میں پانی بہتا ہے۔ یہ ہمارا خود سے کل کا وعدہ تھا کہ ہم یہاں رکیں گے۔ اگر میں مصور ہوتی تو اپنے برش سے اس منظر کو کاغذ پر بکھیرتی کہ وہ فوٹوگراف سے زیادہ موثر ہوتی ہے، فوٹوگراف تو جذبات سے عاری ایک صنف ہے جبکہ مصور کے ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر اس کے اپنے جذبات کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ دائیں طرف بہت نیچے ایک عورت دو

گھڑوں میں پانی بھر رہی ہے۔ جب ایک گھڑا بھر گیا تو اس نے وہ گھڑا اٹھایا اور پتلی سی پگڈنڈی پر چڑھتی ہوئی آہستہ آہستہ اوپر کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے کم از کم اپنے گھر تک کا یہ فاصلہ پندرہ منٹ میں طے کیا۔ اور ابھی تو اسے دوسرا گھڑا لینے دوبارہ نیچے جانا ہے۔ کتنی مشکل ہے اس کی زندگی اور اس کے باوجود روزمرہ کی زندگی کی تفریحوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ ہر جگہ مرد ہی پکنک مناتے یا کرکٹ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ ایسی زندگی دیکھنے کے بعد تو یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔

اور پھر چار باغ کا چھوٹا سا بازار، چھوٹی چھوٹی بچیاں بڑے بڑے دوپٹے لپیٹے خوبصورت گڑیوں کی طرح لگتی ہیں،۔ ایک بات امید افزا ہے کہ ہر گاؤں میں گرلز سکول اور کالج ہیں۔ ایک اور وادی کا نظارہ جس کے پہاڑوں پر ایک بڑا ماڈرن ہوٹل اور اس کے نیچے بہتا ہوا دریائے سوات، جابجا کھیتوں کے رنگ برنگے ٹکڑے کہ لگتا ہے قدرت نے قالین کے نمدے بکھیر دئے ہوں اور ساتھ میں فضا میں آگ لگاتے ہوئے خوبانی اور آڑو کے درخت۔ اگر وادی کے پار جانا ہو تو اس کا بھی انتظام ہے۔ بجلی کے تار پر چلتی ہوئی کیبل، دو پرانی سی ٹرالیاں جو باری باری بس سے اترے مسافروں کو ان کے گاؤں تک پہنچاتی ہیں۔ سوات کے پتھروں کی طرح مجھے یہاں کی ان ٹرالیوں پر بھی اعتبار نہیں تھا۔ میرے ساتھ ایک چھ سالہ بچہ بیٹھا تھا۔ ٹرالی چلنے کے چند لمحوں بعد میں نے نوٹس کیا کہ میں نے اس بچے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ وادی کے پار ہم ایک عارضی سی سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچے جہاں الیاس ہوٹل شارجہ تھا، جس کو ایک بارہ سال بچہ چلا رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی سپیشل چائے کی آفر کی جسے ہم نے فوراً قبول کر لیا۔ یہاں پر بہت سے لوگ تھے کچھ لوگ شوقیہ مچھلی پکڑ رہے تھے، کچھ لوگ پکنک منا رہے تھے۔ منگورہ سے آئی ہوئی ایک پارٹی کھانا بنا رہی تھی، کچھ لوگ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میں ایک واحد عورت تھی جو وہاں بیٹھ کر چائے پی رہی تھی۔ غرض ایک الگ دنیا تھی کوئی سائے دار درخت نہیں تھا اس لئے مجھے صاحب لوگوں کی طرح ایک ٹین کے شیڈ کے نیچے کرسی پر بیٹھ کر چائے پینی پڑی۔ کرسیوں پر کبھی پلاسٹک رہا ہوگا اب تو اس کو بان سے بن دیا گیا تھا۔ ساتھ میں ایک اسٹول تھا جو میز کا کام دے رہا تھا۔ ہم بہت دیر تک بے داغ اور

شفاف رنگت والے بچوں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور پھر اسی ٹرولی میں بیٹھ کر واپس آ گئے۔

شام کے چار بج چکے تھے۔ سید محمد حبیب الرحمان اینڈ مچھلی فروش کا بورڈ دیکھ کر ہم فوراً رک گئے۔ گاڑی بائیں طرف کھڑی کر کے ہم دائیں طرف نیچے اترنے لگے۔ ایک اور گاڑی میں بیٹھے دو نوجوانوں نے مجھے معترض نگاہوں سے اپنا دھوپ کا چشمہ نیچے کر کے دیکھا اور طنز سے کہا، خدا کی قدرت ہے۔ دریائے سوات کے کنارے گنے کے چھلکوں سے بنی چار پانچ ہٹس تھیں۔ ہٹ کے اندر ایک چارپائی اور چند کرسیاں تھیں۔ کیونکہ ہمارا سونے کا قطعاً ارادہ نہیں تھا اس لئے ہم ایک کھلے سائبان کے نیچے بیٹھے جس میں ایک میز اور چار کرسیاں تھیں۔ پہلے ہم تندور کی طرف گئے، جہاں سے ہم نے اپنی پسند کی مچھلی نکلوائی اور اس ایک کلو مچھلی کو خوب مسالہ لگوا کر تلنے کا آرڈر دیا۔ یہاں بھی ہر طرف میلے کا سا سماں تھا۔ کہیں کرکٹ کھیلی جا رہی تھی، کہیں گاڑیوں کو دریا میں کھڑا کر کے دھویا جا رہا تھا۔ گرما گرم مچھلی، نان، لیموں اور دریا کا کنارا۔۔۔ کب سوچا تھا کہ اتنا مزہ آئے گا۔ ہماری میز پر جولڑکا کھانا لا رہا تھا اس کا قد کم از کم ساڑھے چھ فٹ رہا ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا تمہارا قد کتنا ہے؟ بولا! ہم کو نہیں معلوم۔ اس دن پہلی مرتبہ ہم نے ایک بچے کو وہاں مانگتے دیکھا۔ اس بچے نے مانگنے پر لمبے لڑکے سے چانٹا بھی کھایا۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ وہاں گذارا اور پھر سرینا ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں سے تر و تازہ ہو کر ہم فوراً ہی مرغزار کے لئے روانہ ہو گئے۔ مرغزار، سیدو شریف سے پندرہ کلومیٹر پر واقع ہے اور اپنے نام ہی کی طرح نہایت سرسبز جگہ ہے۔ یہاں کی مشہور جگہ سفید محل ہے جو بذات خود آرٹ کا ایک پراسرار نمونہ ہے۔ یہ محل سوات کی ریاست نے ۱۹۴۱ء میں بنوایا تھا، اور اس کے نام کی وجہ وہ سفید ماربل ہے جو اتنا بے داغ ہے کہ کہیں کوئی دھبہ نظر نہیں آتا۔ دن میں بھی ایسا لگتا ہے جیسے ہر طرف ٹیوب لائٹ کی سفید روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اندر جانے کا ٹکٹ ۳۵ روپے ہے اور آپ کی تواضع چائے اور کیک سے کی جاتی ہے۔ محل کے دائیں طرف ایک بڑا سا پانی کا نالہ بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے اترتا ہے۔ اب اس محل کو ہوٹل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لان میں سفید سنگ مرمر ہی کی چند میزیں اور کرسیاں ہیں جن پر نہایت باریک جالی کا کام ہے۔ بڑے بڑے شاہانہ ستونوں پر کھڑا یہ محل بڑے رعب و دبدبے کا تاثر دیتا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ ہیں جو اس کی پراسراریت اور خاموشی کو بڑھاتے ہیں، صرف نالے کا

تیز پانی ہے جو سرکشی سے پتھروں اور کناروں سے ٹکراتا ہے اور کبھی فضا میں موسیقی بکھیرتا ہے اور کبھی خوف کا باعث بنتا ہے۔ دو ہینڈی کرافٹ کی دکانیں ہیں، جن کی وجہ سے وہاں زندگی کے کچھ آثار نظر آ رہے تھے۔ واپس ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ ڈائننگ روم میں ہمارے علاوہ ایک پارٹی اور تھی۔ کھانا کھا کر کچھ دیر ہم باہر بیٹھے اور پھر کمرے کی راہ لی۔

سرینا میں ہم ٹی وی دیکھ سکتے تھے، اس لئے ایک بار پھر دنیا سے رابطہ ہو گیا۔

آج ۲۲ مارچ کا سورج طلوع ہو چکا ہے اور پوری دنیا بغداد کو اپنے ٹی وی سکرینز پر جلتا دیکھ رہی ہے۔ سی این این کے تبصرے بے حسی سے جلتے ہوئے عراق کو دیکھ کر ''اوور ویہلمنگ'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، وہ ان شعلوں میں صرف اپنی سائنسی کامیابی دیکھتے ہیں، وہ صرف صدام کی سرکوبی کو دیکھتے ہیں، اپنے کان بچوں اور بوڑھوں کی طرف سے بند کر لیتے ہیں۔ کامیابی کے نشے نے انہیں ہر فاتح کی طرح اندھا کر دیا ہے۔ عراقی ابھی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت سے مایوس نہیں ہوئے۔ جمعہ کی نماز میں عراقی مردوں کو چہرہ چھپائے مساجد میں جھکا دکھایا جاتا ہے۔ ریلیجن از ان اوپیم اوف دی اوپریسڈ۔

اس وقت مغرب کو کسی خدا کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود خدا ہے۔ وہ خود تاریخ کے لکھنے والے ہیں۔ خدا کی ضرورت صرف تیسری اقوام کی دنیا کو ہے۔ دوسری طرف جیو کے مبصرین کی آواز اور الفاظ میں ایک دکھ ہے کل رات بار بار جیو کا مبصر کہتا تھا دیکھئے! بغداد ہماری نظروں کے سامنے جل رہا ہے امریکی فوجیوں کی طرف جاتے ہوئے میزائل کو اس طرح پرامید نظروں سے دیکھتا تھا جیسے وہ امریکنوں کے ہزار میزائلز سے زیادہ پر اثر ہو۔ شاید ہم اس وقت شیعہ سنی کی فرقہ واریت کو بھول جائیں تو جنگ کا نقشہ بدل جائے۔ بہت سے ملک عراق کا حشر دیکھ کر تھر تھر کانپتے ہیں، حکمران عوام کی آواز کو دباتے ہیں اور امریکا کو بار بار یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم صدام نہیں، ہم تو اچھے بچے ہیں۔ ہم تمہاری ہر بات پر آمنا و صدقنا کہیں گے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم قرآن کی اس آیت پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ جس کو چاہے عزت دیتا ہے، تو ہم کون ہوتے ہیں اس کی حکم عدولی کرنے والے۔ ڈاکٹر شاہد مسعود کو لوگ اے آر وائی پر فون کر رہے ہیں کہ شاہ نعمت اللہ کی پیشگوئیاں پڑھیں۔ غرض ہر ٹیلیفون ایک بے بسی کی آواز ہے۔ سوچا جائے تو شاید ہم اس ایک قطرے کے منتظر ہیں۔ وہ بہادر قطرہ کون ہوگا کہ اس کے

ساتھ مزید بارش کے قطرے شامل ہوں گے اور پھر موسلادھار بارش، کہ یہی وہ معجزہ ہو سکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں جس کی منتظر ہے نگاہ۔ شاید پھر جزا و سزا اسی دنیا میں ہو جائے۔ فی الحال تو ہم تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔

لوگ پریشان ہیں کہ اگلی باری ہماری نہ ہو مگر کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہم پر بمباری کی ضرورت نہیں ہوگی، ہمیں تو سسکا سسکا کر مارا جائے گا کہ ہم تو پہلے ہی ان کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ مانا کہ رزق دینے والا خدا ہے مگر وسیلہ تو کوئی ہوتا ہی ہے۔ افسوس کہ ہمارا وسیلہ فرعون ہے۔ ہم کہ آسان زندگی بسر کرنے والے لوگ اپنے بہترین ذہنوں کو امریکا کی خدمت پر مامور کر کے خود ''مور لویل دین دی کنگ'' ہیں ۔

ہمارے یہاں ۲۳ مارچ کی پریڈ ملتوی ہو چکی ہے۔ ہر روز صبح جب ہم اپنے سفر کا آغاز کرتے تھے تو ہر طرف دھوپ پھیلی ہوتی تھی مگر آج بادل ہیں اور ہلکی سی پھوار ہے۔ ایک طرف عراق کی جنگ اور پھر یہ بادل، ایک اداس سی صبح ہے۔ ہم سرینا کے کمرہ نمبر ۱۱۸ کو الوداع کہتے ہیں۔ گاڑی میں سامان رکھتے ہیں اور ڈائننگ ہال کا رخ کرتے ہیں۔ کل صبح جب ہم بحرین سے نکلے تو ہم نے پٹرول کی تلاش شروع کی مگر راستے میں کہیں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ہم پٹرول نہ ڈلوا سکے۔ امید تھی کہ آج پٹرول مل جائے گا۔ ارادہ تھا کہ آج صبح میں سرینا کے فلک سیر لان کے برآمدے میں ناشتہ کروں گی مگر ہر آرزو پوری ہونے لگے تو کیا بات ہے۔ برآمدے میں بہت ٹھنڈ تھی۔ اس لئے ناشتہ ڈائننگ روم میں ہی کیا گیا۔ کریم کلر کے بے شکن جوڑے میں ملبوس، براؤن کوٹ اور براؤن گلگتی ٹوپی پہنے بیروں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ان کے لہجے میں ایک ملائمیت ہے جو دل کو موہ لیتی ہے۔ ناشتہ کر کے ہم مالاکنڈ اور مردان کی ٹوٹی ہوئی سڑکوں سے ہو کر رسالپور پہنچے۔ کچھ دیر وہاں کے کلب میں تازہ دم ہوئے مگر وہاں چائے نہیں مل سکی اور پھر شام سات بجے اسلام آباد پہنچے۔

اسلام آباد، بلند و بالا کوہساروں کا شہر زیرو پوائنٹ سے مرگلہ تک جاتی ہوئی خوبصورت سڑک کا شہر کہ جہاں موسم بہار میں پور پور پھول کھلتے ہیں۔ وہ مقام جہاں ہر موسم بڑی شدت سے آتا ہے اسلام آباد کے بننے سے پنڈی شہر میں زیادہ فرق نہیں آیا صرف اتنا ہوا کہ اسلام آباد سے نکل کر جب

آپ منو بھائی کے اس شہر میں داخل ہوں تو اس کی غربت کا زیادہ احساس ہوتا ہے مگر کیا کریں کہ اور چیزوں کی طرح شہر بھی اپنی قسمت لے کر پیدا ہوتے ہیں محل کے سائے میں رہ کر بھی جھونپڑے اپنی قسمت نہیں بدل سکتے۔

سر! ہمارا وطن ہے، ہماری سرزمین ہے ہماری دھرتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔؛

یہ ہے اسلام آباد کا مرصع و مسجع، جھوٹ اور تصنع سے بھرا وی آئی پی کلچر۔ ہم اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر جہاز کے انتظار میں کھڑے تھے کہ یہ الفاظ ہمیں سنائی دیے۔ کوئی ضرورت مند غیر اہم شخص کسی بہت اہم شخص سے گفتگو کو طول دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس شخص کو اپنی گاڑی میں لفٹ دینے پر مصر تھا۔ اس سے راہ و رسم بڑھانے کے لئے اس کا کارڈ لینے کی کوشش تھی۔ بہرحال آپ جیسے ہی اس ٹوئین سٹی کی زمین پر اتریں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کچھ نہیں ہیں اور یہاں رہنے کے لئے آپ کا کچھ ہونا بہت ضروری ہے، کیونکہ یہاں ہر شخص کی ایک پہچان ہے۔ یہ شہر عوام کے خدمت گاروں کا شہر ہے، یہاں سب کے دلوں میں ملک کی محبت اور خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہاں آپ کو محفل میں بیٹھنے کے ادب و آداب آنے بہت ضروری ہیں ورنہ آپ بے آبرو ہو کر شہر سے نکالے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ کچھ نہیں ہیں تو آپ کو واہ واہ اور بہت خوب جیسے الفاظ دُہراتے رہنے چاہئیں کیونکہ یہاں پر ہر شخص کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ یہ اس جمہوریت کا شہر ہے جو فوج کے سائے تلے پنپتی ہے۔ جہاں بڑے سے بڑے سیاست دان کو سیٹ پر بیٹھنے کے لئے فوج سے کلیئرنس لینی پڑتی ہے، جہاں ایک اشارے پر لوگوں کو عزت مل جاتی ہے اور دوسرے اشارے پر پھانسی چڑھا دیا جاتا ہے، جہاں ملک کے پہلے وزیراعظم کو کمپنی باغ میں گولی ماردی جاتی ہے اور پھر اس باغ کا نام لیاقت باغ رکھ دیا جاتا ہے۔ جہاں ڈرتے ڈرتے درخواست گزاری جاتی ہے کہ! سر اگر اجازت ہو، اگر جان کی امان پاؤں تو۔۔۔ اب ہمیں بھی موقع دیا جائے۔ وعدہ ہوا تھا کہ سب کی باری باری ٹرن آئے گی۔ آواز آتی ہے! خاموش رہو کتنی بار ہم نے تم کو موقع دیا گیا مگر تم لوگ تو نالائق ہو۔ سچ کہو کیا واقعی دل میں ملک کی خدمت کی لگن پاتے ہو؟؛ سر ویسی تو نہیں پاتا جیسی آپ کے دل میں ہے مگر پھر بھی اللہ کے نام پر، روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر، عوام کے لئے پیلی ٹیکسی کے نام پر اور پھر سب سے بڑا اسلام کے نام پر؛۔ جواب آتا ہے

!اچھا اچھا سوچیں گے۔ غرض انہی کے حکم سے ہر آرزو کے پھول کھلتے ہیں۔ اسلام آباد کی سیاست بھی وڈیروں کی سیاست کی طرح ہے کہ اگر باپ ضیاء الحق یا ایوب خان ہے تو بیٹے سیاستدان ہیں۔ جیسے ایک ہی خاندان میں ایک مسلم لیگی ہے تو دوسرا پی پی میں، تاکہ حکومت کی باگ ڈور ہر صورت میں اپنے ہی ہاتھ میں رہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ایک فوجی چھت کے نیچے جمہوریت کیسے سانس لے سکتی ہے۔

اور سب سے آخر میں یہ بیوروکریٹس کا شہر ہے۔ وہ بیوروکریٹس جو یہاں کے سدا بہار بادشاہ ہیں۔ جو آتی جاتی حکومتوں کو کسی شاطر کی طرح زیرِلب مسکراہٹ سے دیکھتے ہیں۔ دراصل تو یہ ہیں جو سیاہ و سفید کے مالک ہیں، بقیہ حاکم لوگ تو صرف ''فاسن یور سیٹ بیلٹ'' کے سائن کو فالو کرتے ہوئے فلائٹ کے لمبے ہونے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ بہرحال امید پر دنیا قائم ہے کہ شاید کبھی اس سرزمین سے کوئی چمن میں دیدہ ور کرنے والا پیدا ہو جائے۔

ہم صبح آٹھ بجے اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو پتہ چلا کہ موسم کی خرابی کے باعث اسکردو کی فلائٹ کینسل ہو چکی ہے۔ امیدوں پر اوس پڑ گئی، اسکردو اور گلگت کے پہاڑ نگاہوں میں گھوم گئے۔ ہم تو کے ٹو بیس، ہنزہ ویلی، شنگریلا اور نہ جانے کہاں کہاں کے پروگرام بنائے بیٹھے تھے، حالانکہ جاوید منٹو نے کہا کہ کہاں جاتے ہو؟ یہ بھی کوئی موسم ہے اسکردو جانے کا۔ جب سیبوں کے پیڑ بوجھ سے جھکے نہ ہوں، فضا میں پھولوں کی خوشبو نہ ہو اور لوگوں کے چہرے خوشی سے کھلے نہ ہوں تو اسکردو جانے کا کیا فائدہ۔ خشک موسم ہوگا اور لوگ خود زندگی سے تنگ آئے ہوئے ہوں گے؛

مگر ہم نے سوچا چلو اس حال میں بھی اسکردو کو دیکھا جائے، جس حال میں اسے کوئی نہیں دیکھنا چاہتا، مگر سب کچھ اپنے ہاتھ میں ہوتا تو کیا بات تھی۔ اپنی گاڑی ہم کل ہی این ایل سی سے بھیج چکے ہیں اس لئے سڑکوں سڑک جانا بھی مشکل ہے، ہم نے اگلی فلائٹ کراچی کی لی اور یہاں کی تپتی ہوئی گرمی میں پہنچ گئے اور پھر غمِ دوراں کے لئے ٹی وی کا بٹن دبا دیا۔

۲۵ مارچ! پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ سنا ہے کہ آج کی رات بغداد پر بہت بھاری ہے۔ دیکھیں کل کا سورج طلوع ہونے پر کیا نظارہ دکھاتا ہے۔ دیکھیں کہ کیا شہنشاہ بش صدام سے پوچھتا ہے کہ! بتا اب تجھ سے کیا سلوک کیا جائے؟ اور کیا صدام وہی صدیوں پرانا جواب دیتا ہے کہ ''وہی جو ایک

بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔''

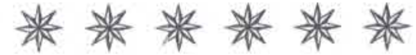
اور اگر یہ سب ہو بھی جائے تو عام لوگوں کو کون جواب دے گا۔ ان عورتوں کو کون جواب دے گا جنکے سر کی چھت اور سہاگ دونوں اجڑ چکے ہیں۔ ان بچوں کو کون جواب دے گا کہ ان کے ننھے قہقہے آہوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ دنیا بدل چکی ہے۔ آج اکیسویں صدی میں جب ہر طرف جمہوریت کا چرچا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سب کچھ محض دکھاوا ہے، دراصل یہ صرف دوغلی پالیسی ہے۔ اصل میں دنیا وہی ہے، وہی طاقت کا استعمال ہے۔ مگر ہاں ایک بات ہے کہ آج ایک امریکن دنیا کے سامنے اپنے صدر کو کہہ سکتا ہے کہ ''شیم آن یو بش، شیم آن یو'' یہ ایک ایکٹر کی آواز ہے۔ بس صرف یہی فرق ہے ہمارے اور امریکا کے شہنشاہ میں۔ اس بات کا سہرا صرف امریکا کو ہی جاتا ہے کہ وہ اپنے ٹی وی کا گلا نہیں گھونٹتے، مغرب کا بادشاہ کم از کم اپنے لوگوں سے تو وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ ہمارے شہنشاہوں میں سچ کو سننے کی ہمت ہی نہیں ہے۔ یہاں تو ایک حکم زباں بندی ہے۔ ہوا ہے حکم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔

ٹی وی سکرین پر ایک کہرام ہے۔ امریکا اپنی بندہ پروری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ایک ٹرک سے کھانے کے ڈبے پھینکے جا رہے ہیں اور لوگ دیوانوں کی طرح ان ڈبوں پر بھوکے کووں کی طرح ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ جب تک امریکا پوری دنیا کو فقیر نہیں بنا دے گا اس کو چین نہیں آئے گا۔ ہم راتوں رات ایک قوم کو فقیر ہوتے دیکھتے ہیں۔ ایک بار پھر دجلہ و فرات کے کنارے انسانیت پانی کے لئے تڑپتی ہے۔ پہلے عراقیوں کو غلامی سے بچانے کے لئے ہیومینیٹیرین بومب پھینکے جاتے ہیں اور اب ہیومینیٹیرین امداد دی جا رہی ہے۔ جو چاہے سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔

صدر بش کا کہنا ہے کہ ہر آنے والا دن صدام کو کمزور کر رہا ہے اور ہر آنے والا دن عراق کو آزادی کے نزدیک کر رہا ہے۔ یہ کون سی آزادی ہے جس کا ذکر صدر بش کرتے ہیں۔ طاقت کے نشے میں امریکا بھول چکا ہے کہ جھوٹ اور سچ کے درمیان بھی ایک سرحد ہوتی ہے، جہاں سے سچ ختم ہو جاتا ہے اور جھوٹ شروع ہو جاتا ہے اور جب کسی قوم میں سچ اور جھوٹ کی تمیز نہ رہے تو وہ اس قوم کے زوال کا

آغاز ہوتا ہے ۔ آج عراقیوں کی دونوں آنکھیں نکال کر امریکا عراق میں چراغاں کرنے چلا ہے۔
زندگی کا سفر یوں ہی جاری وساری رہے گا کہ صعوبتیں بھی سفر کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔







سبوحہ خان کی پہلی کتاب "دلی سے ڈیفنس" 1999 میں شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں انہوں نے 1947 سے 1997 تک کے تاثرات اور تجربات کا اظہار کیا ہے۔ سبوحہ خان کے چند ترجمے اور افسانے ایک ادبی و سماجی رسالے ارتقاء میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اپنا دیس اپنے لوگ ایک نیا تجربہ ہے اس مختصر سفر نامے میں انہوں نے منظر نگاری کے علاوہ اس وقت کے حالات پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ شاید پہلی مرتبہ ہے کہ کسی اردو کتاب کے ساتھ اس کی آڈیو سی ڈی لانچ کی جارہی ہے یہ سی ڈی ان کی اپنی آواز میں ہے کیوں کہ پی ٹی وی کی نیوز ریڈر رہنے کی وجہ سے انہیں اپنی آواز اور تلفظ پر مکمل کنٹرول ہے۔ امید ہے کہ اس تجربے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور یہ تجربہ کامیاب رہے گا۔

Designed & Printed by: ArtView Ph: 021-2635046